اصلاح الخیال

تالیف

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

۱۲۸۰ - ۱۳۶۲ھ
۱۸۶۳ - ۱۹۴۳ء

اصلاح الخیال

تالیف

حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

۱۲۸۰ - ۱۳۶۲ھ
۱۸۶۳ - ۱۹۴۳ء

ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل ٹرسٹ رجسٹرڈ

تمہید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد الحمد والصلاۃ!

واضح ہو کہ ایک شخص نے اپنے ایک عزیز کو در بابِ اتباعِ شریعت ودرستی اعمال ووضع کے نصیحت کے طور پر لکھا تھا، خیالاتِ جدیدہ کے غلبے سے اس نصیحت میں کچھ شبہات واوہام اس عزیز کی طبیعت میں پیدا ہوئے، جس کی اطلاع اس شخص کو کی گئی، اس شخص نے اس کے جواب لکھے، چوں کہ ایسے شبہات اکثر لوگوں کو پیدا ہوتے ہیں، اس لیے فائدۂ عامہ کے واسطے مصلحت معلوم ہوا کہ وہ شبہات اور ان کے جوابات ایک جا جمع کر کے مجموعے کا نام ''اصلاح الخیال'' رکھ دیا جاوے۔ اور ایک زمانے میں ایک شخصِ کامل نے ایک خط نصیحت آمیز بعض معززین متبعِ خیالاتِ جدیدہ کو تحریر فرمایا تھا، جس کے بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی، اس کی نقل بعض لوگوں کے پاس تھی، اس کے مضامین بھی اس مجموعے کے مناسب تھے، اس لیے اس کا بھی الحاق کر دینا آخر میں مناسب معلوم ہوا۔ فقط

والسلام

العبد الضعیف

محمد اشرف علی عفی عنہ

تقریرِ شبہات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریر شبہ اول: میرے خیال میں جس نگاہ سے شریعت اور اتباعِ شریعت کو ہندوستان میں علمائے دین دیکھتے ہیں وہ شرائطِ اسلام نہیں ہیں، زمانے کی رفتار نے اور اللہ کی مشیت نے ملک پر انگریزوں کو حکمران کر دیا، جس وقت مسلمانوں کی اول سلطنت قائم ہوئی تھی اس وقت کی تواریخ نکال کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ قبل از بعثت جو حالت مسلمانوں کی تھی اس سے بدتر حال دیگر اقوام کا تھا، مثلاً: انگلستان میں مقدمات کی تحقیقات میں ثبوتِ جرم کے لیے گرم کھولتے ہوئے پانی میں مجرم کے ہاتھ ڈالے جاتے تھے، اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر اس کے ہاتھ نہ جلے تو وہ ضرور بے گناہ ہے، سزا میں یہ سزا دی جاتی تھی کہ زندہ آدمی کو جلا دیتے تھے، بہر صورت! موازنہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومِ عرب زمانے کی رفتار کے موافق کوئی پس ماندہ قوم نہ تھی، بلکہ اس زمانے کی مساوی قوموں کی یہی ابتر حالت میں اسلام نے ان کی اصلاح کی، ان کے اخلاق درست کیے، توحید سکھائی، اور یہ ایک نئی قوم عرصۂ روزگار میں برآمد ہوئی، اور شمشیر بکف جس طرف نکل کھڑی ہوئی فتحِ ملکی ان کے آگے آگے ہوتی گئی، یہاں تک کہ برِاعظم ایشیا اور یورپ کے بڑے حصّے کو فتح کر ڈالا، فتح ونصرتِ ملکی میں تائید من جانب اللہ قرآن اور حدیث سے ثابت ہے، اس لیے اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جس قوم میں صلاحیت اور اتباعِ احکامِ خداوندی پایا جاتا ہے اس پر اللہ کی مدد ہوتی ہے۔

چناں چہ مسلمانوں نے فتح کر کے جو سلطنتِ عظیم قائم کی اس کی مثال تاریخ میں نہیں ہے، بعد زمانۂ خلفائے راشدین کے باہم وہ نزاع شروع ہوئے، اور مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے وہ شرمناک واقعۂ کربلا سرزد ہوا جس کی وجہ سے قیامت تک مسلمانوں کو ندامت رہے گی، زوالِ سلطنت کے آثار شروع ہوگئے۔ لیکن چوں کہ کوئی قوم سربرآوردہ اور تعلیم یافتہ صفحۂ ہستی پر موجود نہ تھی، اس لیے مسلمانوں کو اس حصۂ ملک میں جہاں ان کی سلطنت قائم ہوچکی تھی امن

نصیب رہا، فتوحاتِ ملکی بند تھیں اور حدودِ سلطنت قائم ہوگئی۔ لیکن روز بروز آثارِ روایت ظاہر تھے، یعنی ملک میں امن قائم رکھنے اور دوسری قوموں کے حملوں سے بچنے کی کوئی تدبیر مسلمانوں نے نہیں کی، ملک میں جو جو ظلم ایک ادنی زمین دار اپنی رعایا پر کرسکتا تھا اس کی مثالیں غدر سے پہلے تک پائی جاتی تھیں۔

یہاں تک دسویں صدی کے قریب اہلِ یورپ نے ترقی کرتے کرتے مصالحۂ حرب یعنی باروت وغیرہ دریافت کی، اور مسلمان بادشاہوں کی شامت آئی، جس زمانے کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس کو ابتدائے زمانہ قرار دے کر مسلمانوں کی حالت کا اندازہ دیگر اقوام سے کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ ابتدائے اسلام میں مسلمان خوش اخلاق، جری، ہمت والے تھے، دوسری قوموں میں بزدل، آرام طلب، کم ہمت تھے، مسلمان جہاں تھے وہیں رہے، بلکہ آگے چل کر اس سے بھی گرتے گئے، اور دوسری قومیں ترقی کرتی گئیں، یہاں تک کہ روم کو لڑتے لڑتے پریشان کردیا، اور اگر سلطان عبدالحمید خان اس رنگ میں نہ رنگ جاتے جو اس وقت سلاطینِ یورپ کا ہے تو بقائے سلطنت ناممکن تھی، اگر سلطانِ روم ہندوستان کا اسلام اپنے یہاں قائم کریں تو کسی کو ان کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑے، خود بخود ان کی زوالِ سلطنت کے لیے کافی ہو جاوے، انھوں نے زمانے کی ضرورت کے موافق فوج میں وہ وہ سامان کیے ہیں جن کو ہندوستان کے علما کبھی جائز نہیں کہہ سکتے، اور آپ سے سچ کہتا ہوں کہ اگر سلطان اس بات کا وعدہ کرلیتے کہ میں علمائے ہند کے احکام کی تعمیل کروں گا، اور پھر یہاں سے چند علما ان کا طرزِ تمدن درست کرنے کے لیے جاویں، اور وہ اپنے وعدے کے موافق اس پر عمل کریں تو اور تو میں کہہ نہیں سکتا، مگر سلطنت قائم نہ رہے۔

اب اگر یہ کہا جاوے کہ بلا سے سلطنت قائم نہ رہے اتباعِ شریعت بڑی چیز ہے، اور عاقبت کی درستی ہو جاوے، سلطنت رہے یا نہ رہے تو ایسا جینا پراگندہ روزی پراگندہ دل کا کیا نفع ہے۔ دوسرے یہ کہ نتیجہ بس یہ نکلے گا کہ اسلام ہم کو حکومت اور سلطنت نہیں سکھلاتا ہے، بلکہ ذلت اور دریوزہ گری تعلیم کرتا ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، پہلے مسلمانوں کی مثال اس

وقت بالکل فضول ہے، کیوں کہ وہ رنگ زمانہ کا نہیں، اگر آج سلطانِ روم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سا طریقہ اختیار کریں، یعنی بیت المال کا اونٹ تلاش کرنے خود چل دیں تو آپ دانا ہیں، ذرا اندازہ کیجیے کہ سلطنت کرسکتے ہیں یا نہیں۔ اور ہرگز نہیں، یہ اُس زمانے کے شایاں تھا کہ خود خلیفہ راتوں کو رعایا کی خبر لیتے پھرتے تھے، اور چوروں کو کول مزدوری پر پہنچا دیا کرتے تھے۔

دوسرے شبہے کی تقریر: یہ وہ وقت ہے کہ ملک علم کے زور سے قائم ہے، شمشیر کے زور سے نہیں، ایک شخص دلاور شمشیر بکف نہایت جرأت کے ساتھ میدان میں آتا ہے، لیکن ایک ہزار قدم سے ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے، اور جس چیز سے ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے اس میں ایک ذرا سی دور کے اندر اس قدر گولیاں علم کے زور سے بھر دی ہیں کہ ایک منٹ میں بیس فیر کرے، کہاں تک خالی جائیں گے۔

تیسرے شبہے کی تقریر: افسوس کہ مسلمانوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی نعمتوں کی قدر نہ کی، پانی سے وہ کام نہ لیا جس کی وہ شایاں تھا، بس پیاس میں پی لیا، وضو کیا، غسل کیا، طہارت کی، اب وہی پانی ہے کہ جس سے بھاپ پیدا ہوتی ہے، اور جو کام ایک ہزار آدمیوں کی قوت سے نہیں ہوسکتا اس کو ایک آدمی کرتا ہے۔

چوتھے شبہے کی تقریر: بھلا اس میں کون بات خلافِ شریعت ہے؟ جو کبھی مسلمانوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی، یا اب دوسروں کو دیکھ کر نہیں کرتے۔ یہ ایک ادنیٰ سی مثال میں دیتا ہوں۔ اس طرح دنیا میں ایک ایک چیز کی بابت اس وقت کوئی ہو تو ایک ایک دفتر لکھ ڈالے، وہ کون سی چیز ہے کہ مسلمانوں نے استعمال نہیں کی، اور جس کا استعمال انھوں نے اپنے جسمِ فانی تک محدود نہیں رکھا، اپنے ابنائے جنس کو نفع پہنچانے کے لیے اس پر ذرا بھی غور نہیں کیا، یہ بات مسلمہ ہے کہ قیامت کے دن ذرا ذرا چیز سے حساب لیا جاوے گا۔ میرا تو قریب قریب یہ عقیدہ ہے کہ جس شخص نے ایسی بے ترتیبی کے ساتھ اللہ کی نعمتوں کو استعمال کیا وہ ضرور مستوجب جواب دہی ہے۔

پانچویں شبہے کی تقریر: اس وقت کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ کس چیز کو شرطِ اسلام قرار دیا جاتا ہے؟

چھٹے شبہے کی تقریر: جس چیز کی طرف مسلمانوں کو بلایا جاتا ہے وہ اس سے اتنی دور نکل گئے

ہیں کہ ان کے کان میں اس کی آواز بھی نہیں جاتی، میں تو پردیس رہ کر اس تماشہ کو دیکھ رہا ہوں۔

ساتویں شبہے کی تقریر: جو باتیں ہمارے علمائے دین و پیشوایانِ مذہب تعلیم کرتے ہیں ان میں زمانۂ موجود کے موافق ذلت اور خواری کے سوائے یہاں تو کچھ نظر نہیں آتا، عاقبت میں اگر بہشت اور حوریں ملیں تو اللہ سے امید رکھیں۔ لیکن اس سے یہ لازم آتا ہے کہ دنیا میں نکبت کے ساتھ بسر کرنا عاقبت کی درستی کو لازم ہے، اگر فی الواقع ایسا ہے تو صاف الفاظ میں یہی کہنا چاہیے، خواہ مخواہ یوں کہا جاتا ہے کہ بقدرِ ضرورت دنیا بھی حاصل کرو۔

آٹھویں شبہے کی تقریر: ہم کہتے ہیں کہ بقدرِ ضرورت بھی دنیا حاصل نہیں ہوتی اس طریقے سے جو ہم کو اس وقت علمائے دین تعلیم کرتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص کو کتابیں پڑھا کر عالم بنایا، آپ خود متفکر ہیں کہ وہ اب کیا کرے، پچھلی مرتبہ یہ رائے تھی کہ ان کو حرفت سکھلائی جاوے تو وہ بھی کیا، بڑھئی کا کام یا لوہار کا کام۔ اب میں نہایت ادب سے گزارش کرتا ہوں کہ بڑھئی کا کام اور لوہار کا کام سکھلانے، اور تار برقی اور ریل کے ہانکنے کا کام یا اسٹیم بنانے کی ترکیب سکھانے میں شرعاً کیا فرق ہے؟ تو اتنا کہ خود مولوی صاحب نہیں جانتے دوسرے کو کیا سکھلا دیں گے؟ لیکن لوہار، بڑھئی کا کام سکھلانے کے لیے بھی تو ان کو لوہار، بڑھئی نوکر رکھنے پڑیں گے، تو پھر دوسرے فنون سکھلانے والے کیوں نہ نوکر رکھے جاویں؟ مگر بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر کوتاہ اندیشی اور پست حوصلگی اس قدر آ گئی ہے کہ ان کی نگاہ ہی اوپر نہیں جاتی۔

نویں شبہے کی تقریر: میری تو اب یہاں تک شامت آ گئی ہے کہ میں ان مدارسِ عربیہ پر اعتراض کرتا ہوں، اور ان کو بہ حیثیتِ موجودہ کارِ خیر نہیں سمجھتا، اور اس کے ساتھ الحمد للہ کہ مسلمان ہوں، اور اپنے اللہ سے قوی امید ہے کہ مجھ کو مسلمان رکھیں گے۔

اب سنیے کہ میں مدارسِ عربیہ پر کیا اعتراض رکھتا ہوں، قرآن کے احکام کے موافق آپ کے اوپر پہلے اپنے اقارب، پھر پڑوسی، پھر شہر والے، پھر ملک والے، پھر ابن السبیل کے حقوق ہیں، اب آپ ان مدارس کو دیکھیں کہ ان سے کس کو نفع پہنچتا ہے، ہمارا یہ کام نہیں کہ جو آیا اس کو پڑھا دیا، بلکہ یہ کام ہے کہ وہ مفید طرز اختیار کریں جس سے ہمارے بھائیوں کو نفع پہنچے۔

مجھے ایک صاحب ملنے آئے جو علما کے بڑے معتقد ہیں اور ہمیشہ علما کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں اور بڑی خدمت کرتے ہیں، میرا خیال ان کے طرز سے یہ ہے کہ انھوں نے زیارتِ عُلما کو اپنے روزمرہ میں داخل کر رکھا ہے، میں نے ان سے سوال کیا کہ وضو میں کے فرض اور کے سنت ہیں؟ حالاں کہ انھوں نے تسلیم کیا کہ وہ ستائیس برس سے نماز پڑھتے ہیں، لیکن بے چارے اس کا جواب نہ دے سکے، تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ تو کسی مولوی سے ملتے ہوں گے، انھوں نے کہا کہ جناب میں تو روزانہ حاضر ہوتا ہوں، تو میں نے پوچھا کہ بھلا تم کو کسی نے یہ بتلایا کہ وضو میں کے فرض اور کے سنت ہوتے ہیں؟ اگر کہیں سفر میں ہو اور صرف پاؤ بھر پانی ملے تو وضو کیسے کرے؟ غرض میں نے ان کو بتلایا، اور چند مسائل اور بتلائے تو انھوں نے نہایت شکر گزاری کے ساتھ یہ تسلیم کیا کہ مجھ کو عالموں کی صحبت سے اتنا نفع نہیں ہوا جتنا آپ کی چند باتوں سے ہوا، میں اس مثال سے اپنی تعریف کرنا نہیں چاہتا، بلکہ علما کی حالت کا اظہار آپ پر کرتا ہوں کہ ان کی حالت قابلِ اصلاح ہے، اگر یہ درست ہوں گے تو ہم لوگ خود بخود ٹھیک ہو جاویں گے۔

دسویں شبہے کی تقریر: نصابِ تعلیم پر آج سے دس برس پہلے کوئی اعتراض نہ تھا، اور بڑے بڑے عالم گذر گئے، کبھی آپ نے کسی کی زبان سے سنا کہ عربی کا نصابِ تعلیم ناقص ہے، اور اس میں اوقات ضائع ہوتے ہیں، یا مدارسِ عربیہ کے اندر لوہار، بڑھئی کا کام سکھلانا ضرور ہے، یہ نئے علما جو اس وقت پیدا ہوئے ہیں، ان کو البتہ یہ بات سوجھی ہے۔ جنابِ من! علمائے موصوفین کے ہم عصر اگر کوئی موجود ہوں گے تو ان کو ان اعتراضات پر جو اس وقت کے علما، نصابِ دین پر کر رہے ہیں ویسا ہی اعتراض ہوگا جیسا کہ اس وقت کے علما کو کوٹ پتلون پہنتے والوں پر ہے۔ یہ تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ خود علما میں کتنا انقلاب ہے۔

گیارہویں شبہے کی تقریر: جن باتوں کو آج سے دس برس پہلے حرامِ مطلق بتلاتے تھے، اب اس کے جواز پر فتوے دیے جاتے ہیں، آخر یہ کیوں؟ زمانے کی حالت سے جوں جوں خبر ہوتی جاتی ہے کہتے جاتے ہیں۔

بارہویں شبہے کی تقریر: مگر ہمارے علما نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے، اس لیے زمانے سے

جلد جلد خبردار نہیں ہوتے، اگر باہر پھریں، اور مسلمانوں کے بچوں کا حال دیکھیں، اور پھر اندازہ کریں کہ یہ کس حد پر پہنچ گئے ہیں، تو شاید کوئی طریقہ ان کی اصلاح کا سمجھ میں آجاوے، لیکن سمجھ میں آوے گا اس قدر عرصے کے بعد کہ شاید پھر علاج کا موقعہ بھی نہ رہے۔

تیرہویں شبہے کی تقریر: تعلیم علومِ دین مبنی ہے تین چیزوں پر: اعتقادات، عبادات، معاملات، بلکہ آپ تو فرماتے ہیں کہ شرطِ اسلام یہی چیزیں ہیں، شاید تصوف وغیرہ دو چیزیں اور شامل کی ہیں، بہرصورت ان تین چیزوں کا نام ضرور اسلام ہے۔ اعتقادات کا کوئی نصاب نہیں، یہ قائم رہ سکتا ہے عبادات اور معاملات سے، اب رہے معاملات، بڑا حصّہ ان کا لازم ہے سلطنت کو، جس کی سلطنت اس کے قانون کے موافق معاملات ہوں گے، اب آج کل کوئی زنا کرے تو سنگسار نہیں کیا جاتا، چوری کرے تو ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔ اچھا! اب فرض کیجیے کہ کسی نے زنا کیا تو نالش کرنے والا کیا کرے، آٹھ آنہ اسٹامپ پر عرضی دے۔ یہ طریقہ شریعت میں کہاں لکھا ہے؟ پھر حلف سے اپنا اظہار لکھاوے، حلف بھی کیا کہ جو گواہی میری روبرو عدالت میں ہوگی وہ بالکل سچ ہوگی، سوائے سچ کے جھوٹ نہ ہوگی، خدا میری مدد کرے، اس کے بعد شہادت پیش ہوئی، جس کے ساتھ زنا کیا وہ ڈاکٹر کے ملاحظے کے لیے بھیجی گئی، اگر سب طرح ثابت ہوگیا تو چار مہینے کی قید اور دو سو روپے جرمانہ، اور جرمانے میں سے ایک سو پچاس روپے بطورِ معاوضہ مدعی کو دیا جاوے۔

اب ذرا غور تو کیجیے کہ یہ معاملہ اول سے آخر تک کسی مرتبے میں بھی شریعت کے موافق ہوا؟ اور یہ جو ۱۵۰ ان حضرات کو ملے وہ کب جائز ہوئے؟ یا ایں ہمہ یہ روزمرہ ہو رہا ہے، اور شاید علما کو اس کی خبر بھی نہ ہو، یہ ایک ذرا سی مثال ہے، اس سے بڑھ کر معاملات ہو رہے ہیں تو اب جن طالب علموں کو یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں کہ اس جرم کی سزا یہ ہے، اور اس کے یہ، وہ ان کے کس کام آویں گی جب کہ معاملات کا تصفیہ قوانین موجودہ کے مطابق ہوتا ہے۔ اب جس شخص نے مقدمۂ زنا میں یہ حکم دیا وہ مصداق ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کا، لیکن کیا کسی کا خیال اس طرف منتقل ہوا ہے کہ جس شخص نے نالش کی وہ بھی معین ہوا؟ کیوں کہ وہ تو جانتا تھا کہ شرع کے مطابق حکم نہ ہوگا، اب کہنا چاہیے کہ بے شک وہ بھی معین

ہوا، تو اب کیا علاج؟ علاج یہ کہ خاموش گھر میں بیٹھو۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر مسلمانوں کی حالت کو اندازہ کیجیے کہ یہ کیا کریں؟ انھیں تو اللہ میاں اس جہان سے اٹھالیں تو ان کی نجات ہو، غرض! بڑے معاملات تو حکومت کے ساتھ گئے۔

اب چھوٹے چھوٹے معاملات روز مرہ کے ان کے احکام اردو کی کتابوں میں موجود ہیں، جو بچوں کی تعلیم کے نصابِ ابتدائی میں داخل ہیں، یا داخل کرنے چاہییں، عبادات کا باب نہایت مختصر ہے، روزے کے احکام قرآن کے ایک رکوع میں ہیں، اسی طرح نماز کے احکام اردو کی ایک کتاب میں موجود ہیں، حج اور زکاۃ کی بڑے ہو کر ضرورت ہوتی ہے، اور ان کے مختصر احکام ہیں، اس مختصر کو اتنا طول دیا ہے کہ بچوں کے دس برس اس میں خرچ ہوتے ہیں، اور جب تیار ہو کر نکلتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اب کیا کریں؟

چودہویں شبہے کی تقریر: اگر کچھ تعلیم کی عمر باقی ہے، اور کچھ حمیّت کا تقاضا بھی ہے تو جلدی سے طب پڑھ لی، اور معاش کا ایک ذریعہ نکال لیا، اور اگر کہیں عمر ہو چکی ہے، جیسا کہ کثرت سے واقع ہوتا ہے تو سیدھے مسجد کی راہ لی، اور جو کچھ پھر یہ لوگ کرتے ہیں آپ کو مجھ سے زیادہ تجربہ ہے، میں لکھنا کیا چاہتا تھا، اور لکھ گیا کیا۔

پندرہویں شبہے کی تقریر: میں اپنا حال عرض کرنا چاہتا ہوں: میں کوٹ پتلون یا یوں کہیے کہ پورا انگریزی لباس پہنتا ہوں، سوائے ٹوپی کے کہ وہ ترکی ہے، اس ٹوپی کے اختلاف سے یہ لباس ہمارا قومی بن جاتا ہے، اور اگر اس بات کو کوئی اس وقت تسلیم نہ کرے تو دس برس بعد اس کو خود پہننا پڑے گا، میں اس بات کو ایسے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ مجھ کو اس میں کچھ بھی وسوسہ نہیں۔ اب مجھ سے ارشاد ہوا کہ یہ لباس خلافِ شریعت ہے، ترک کرنا چاہیے۔ تو مجھ کو یہ بھی بتلایا جاوے کہ کیا پہنوں؟ جو کام مجھ کو کرنا پڑتا ہے اور جو اللہ نے میری تقدیر میں لکھ دیا ہے اور جس کے کرنے پر قضا و قدر سے مجبور ہوں، وہ ایسا ہے کہ مجھ کو چار گھنٹے گھوڑے کی پیٹھ اور تین گھنٹے بائیسکل پر (اگر بائیسکل نہ ہو تو پھر دوسرے گھوڑے پر) شہر اور اطرافِ شہر میں پھرنا پڑتا ہے، اور یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ مجھ کو بیس میل کا یومیہ سفر ہو جاتا ہے۔ جو پائے جامہ، میں سواری میں پہنتا ہوں وہ اس کپڑے کا ہے جو ہاتھ سے نہیں پھٹ سکتا، تاہم اس قدر جلد گھس گیا کہ

جس پر مجھ کو خود تعجب ہے، ڈھیلے پائچے یا لٹھ کا شرعی پاجامہ ایک دن مشکل سے کام دے سکتا ہے، اس بات کا یقین آپ صرف اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ آپ مجھ کو سچّا آدمی خیال فرمائیں، ورنہ بلا تجربہ کے اس کا یقین ہونا مشکل ہے۔

پتلون اور پاجامہ میں جو فرق سواری کے اندر ہے وہ تجربے پر موقوف ہے، اس کا بیان کرنا مشکل ہے، پہلے لوگوں کا اگر حوالہ دیا جاوے تو میں نصابِ تعلیم کا حوالہ دوں گا، میرا لباس یوں نہیں تبدیل ہوگا، بلکہ اس کی ترکیب یہ ہے کہ کوئی شخص ایسا ہی کام کر کے دکھلاوے، اور پاجامہ، انگاچوغہ، دوپٹہ پہنے، اور اگر وہ کامیاب ہو تو میں قسم کھاتا ہوں کہ فوراً لباس تبدیل کر دوں گا۔

عبادات میں روزہ میں رکھتا ہوں، زکاۃ دیتا ہوں، حج کا ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ پورا کرنے والے ہیں، نماز جماعت کی تو کیا پابندی! وقت سے بھی ادا نہیں ہوتی۔ صبح کی نماز پہلے سے قضا پڑھتا ہوں، اور میں جانتا ہوں کہ برا کرتا ہوں، اور اس کی اصلاح کی میں کوشش کر رہا ہوں۔

سولہویں شبہے کی تقریر: لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید وقت کی فرمائی ہے، لیکن امام شافعی صاحب نے جمع بین الصلاتین کا ایک خاص موقع پر فتویٰ دیا ہے۔ اور حضرت ابوداود صاحب نے صرف لوگوں کے حرج ہونے پر جمع صلاۃ کا ذکر کیا ہے۔

میں اخیر میں پھر اس قدر بیان کرتا ہوں کہ یہ عریضہ میں نے تین بجے رات کو لکھنا شروع کیا، اور اڑھائی گھنٹے میں ختم کیا، لیکن اس میں ایک لفظ بھی میرا آوردہ نہیں ہے، قلم سے یوں ہی نکلتا چلا گیا۔ میں اس کو پڑھ کر دیکھتا ہوں تو اس کا بھیجنا داخلِ گستاخی سمجھتا ہوں۔ لیکن صرف ایک خیال مجھ کو اس کے بھیجنے پر مجبور کرتا ہے، وہ یہ کہ طبیب کے سامنے اپنا مرض بیان کرنا داخلِ گستاخی نہیں ہے، مثلاً: کسی شخص کے سامنے اپنے اعضائے نہانی کھولنا سخت بے جا ہے، لیکن اگر کسی کے کوئی پھوڑا ایسے مقام پر نکل آوے تو بلا تأمل حکیم صاحب کو دکھلاتا ہے، اور اگر حکیم کو دکھلانے میں یہ شخص اتنا ہی تأمل کرے جتنا کہ معمولی طور پر عام آدمیوں سے کرتا تھا، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ زخم اندر ہی اندر سڑ کر ناسور کر لے گا، اور اس شخص کی جان جاتی رہے گی۔

میرا عقیدہ اور میرے خیالات جیسے کچھ ہیں ان کو صرف اس نظر سے پیش کرتا ہوں کہ اگر ممکن ہو تو میری اصلاح کیجیے، اور اگر میری اس پریشان تحریر میں آپ کے نزدیک کوئی کام کی

بات ہو تو للہ اُس پر توجہ کیجیے، وقت ایسا نازک ہے کہ مسلمان تباہ ہوتے چلے جاتے ہیں، اور ان کی کوئی خبر نہیں لیتا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے کلام میں اثر دیا ہے۔ اگر آپ کے نزدیک میں سچ کہتا ہوں تو اس کو سنیے، اور اگر غلطی پر ہوں تو میری اصلاح کیجیے، آخر آپ کا ہوں، مجھ کو بچائیں کہ قیامت کے دن فضیحت نہ ہوں، اگر آپ کے نزدیک میری فلاح اس میں ہو کہ میں نوکری چھوڑ دوں تو مجھ کو صاف صاف ہدایت کیجیے، ورنہ میں تو من وعن آپ پر ظاہر کر چکا۔

سترہویں شبہے کی تقریر: اب میں اپنے عیب کھولنے پر آیا تو ایک اور بات بھی لکھ دوں، کیوں شبہ کو اپنے دل میں رکھوں، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آں حضرت ﷺ کو خاص عرب کی اصلاح کے لیے بھیجا تھا، یا ساری دنیا کی اصلاح کے لیے، میرا خیال یہ ہے کہ صرف قومِ عرب کی اصلاح کے لیے، کیوں کہ اس زمانے کے عرب اپنی زبان میں بڑے فصیح و بلیغ تھے، ان کے لیے قرآن زبان عربی میں نازل فرمایا، جس سے ان کو یقین ہو گیا کہ وہ کلامِ بشر نہیں ہے، اور ان کو ماننا پڑا، اور تمام عمر جناب پیغمبرِ خدا اسی قوم میں رہے، اور جب ان کی تکمیل ہو چکی آپ نے وفات فرمائی، دیگر اقوام نے آپ کے قرآن کو اس بنیاد پر نہیں مانا تھا جس پر کہ عرب نے مانا تھا۔ بلکہ ان لوگوں کو قومِ عرب نے بزورِ شمشیر زیر کیا، اور ان کو زبردستی مسلمان کیا، انھوں نے آپ سے معجزے طلب نہیں کیے، اور نہ مثل عرب کے قرآن پر ایمان لائے۔

فتوحات میں دو اقسام ہوئیں، ایک وہ جنھوں نے عاجز آکر اور مقابلے کی تاب نہ لا کر اسلام قبول کیا۔ دوسری وہ جنھوں نے امن مانگی، اور اپنے دین پر قائم رہ کر جزیہ دینا قبول کیا، ان پر دعوتِ اسلام پوری نہیں ہوئی۔ سب سے بڑی بات غور طلب یہ ہے کہ جناب پیغمبرِ خدا ﷺ تمام جہان میں تشریف نہیں لے گئے، اور بہت لوگوں کو اس وقت بھی آپ کے پیغمبر ہونے کی خبر نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں اسلام بہت زمانے کے بعد آیا، پھر جو ہندو یہاں رہتے تھے ان کی ہدایت کیا ہوئی؟ اور یہی حال امریکہ اور افریقہ اور بڑے حصّہ یورپ اور ایشیا کا تھا، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرقے کے اندر پیدا کیا، اور اس میں وہ مر گئے۔ فقط

تقریرِ جوابات

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلاة والسلام علی رسوله سیدنا محمد وعلی آله وأصحابه أجمعین.

بعد حمد وصلاۃ کے! احقر نے مخاطبِ عزیز کی تمام تر تقریر کو کئی بار دیکھا۔ چوں کہ مثل اظہارِ مرض کے تشخیصِ مرض وتعیینِ اسباب میں بھی معالج کو شرم کرنا مضر ہے، اس لیے ضرور ٹھیرا کہ آزادی کے ساتھ کلام کیا جاوے، اس لیے اولاً اجمالی طور پر اسباب کو متعین کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جہاں تک تقریرِ مذکور کو دیکھا اور پڑھا معلوم ہوا کہ منشا ان خیالات کا صرف دو امر ہیں:

اول: علمِ شریعت میں مہارتِ کاملہ نہ ہونا۔

دوسرے: لامذہبوں کی تقریریں اور تحریریں سننا اور دیکھنا۔

اس لیے علاجِ کلی تو یہ ہے کہ بقدرِ فرصت کسی قدر توجہ کر کے کم از کم ترجمۂ قرآن مجید و "مشکاۃ شریف" کے بعض ابواب اور فقہ کی ایک پوری کتاب کسی سمجھ دار آدمی سے پڑھ لیا جاوے، اور مدعیانِ تحقیق وتہذیبِ جدید کی تقریرات وتحریرات سمع وبصر تک نہ آنے دیا جاوے۔ اور جزئی علاج یہ ہے کہ تقریرِ مذکور کے جواب کو جس کو بعد اجمالِ ہذا کے تفصیلی طور پر لکھنا چاہتا ہوں بغور وانصاف خالی الذہن ہو کر دیکھا جاوے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ سب شبہات دفع ہو جاویں گے، اور اصلاحِ عقیدہ تو فی الفور اور اصلاحِ عمل بتدریج حاصل ہو جاوے گی۔ اب وہ جواب تفصیلی سننا چاہیے۔

پہلے شبہے کا جواب: سب سے اول مخاطب عزیز نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جس نگاہ سے شریعت اور اتباعِ شریعت کو ہندوستان میں علمائے دین دیکھتے ہیں وہ شرائطِ اسلام نہیں ہیں۔ اور اس کو تاریخی دلائل سے جس سے انقلاب اقوام کا معلوم ہوتا ہے ثابت کیا ہے۔ مقامِ انصاف ہے کہ جن لوگوں کی تمام عمر ایک علم کی تحصیل وترقی میں گزر گئی ان کی نگاہ جب قابلِ اعتبار نہیں تو

ایک مؤرخ کی نگاہ احکامِ شریعت کی تحقیق میں کس طرح لائقِ اعتماد ہوگی؟ پھر یہ کہ عالمِ دین تو اپنے ہر دعوے کے اثبات کے لیے قرآن مجید کی آیات اور حدیث شریف کی روایت جو اللہ ورسول کا کلامِ صادق ہے پیش کریں، اور مؤرخ صرف اپنی رائے اور قیاس سے استدلال کرے، پھر بھی عالم کا قول معتبر نہ ہو، اور صاحبِ رائے کی رائے کو ترجیح ہو، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اہل الرائے کی نظر سے ابھی جمالِ شریعت محجوب ہے، اور جس قدر پیشِ نظر ہے وہ محض ایک ناخن ہے، لیلی را بچشم مجنون باید دید کا یہی مطلب ہے، میں صرف اسی مجمل انصاف پر قناعت نہ کروں گا، بلکہ اس تاریخی دلیل کی حالت دکھلاؤں گا۔

خلاصہ اس واقعۂ تاریخی کا صرف مسلمانوں اور دیگر اقوام کی حالت کا موازنہ کرنا ہے، اور بدون نئے رنگ کے اسلامی سلطنت کا قائم نہ رہ سکنا ہے، سو اقوام کی ترقی وتنزل کی بحث اور اس کے اسباب کی تعیین یہ محض زائد مضمون ہے، البتہ دوسرا امر قابلِ توجہ ہے کہ بدون اس نئے رنگ کے حکومت کا قائم نہ رہ سکنا اور قومی تاریخ کے لکھنے سے بھی مخاطبِ عزیز کا مقصود یہی ہے، سو یہ امر اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون سا نیا رنگ جو علمائے ہند کے نزدیک خلافِ شریعت ہے اور اس پر قیامِ سلطنت ہے، اگر مراد اس سے جدید سامانِ حرب وحفاظتِ حدود ہے، سو اس کو کون سے ہندوستانی عالم نے خلافِ شریعت بتلایا ہے، اگر مسئلۂ تشبہ سے سے شبہ پڑا ہے، سو مسئلہ تشبہ کا اول تو ہندوستانی علما کا ایجاد نہیں ہے، قرآن مجید میں موجود، حدیث میں مذکور، تمام دنیا کے علما اس میں شریک، اور اگر کوئی عالم رومی، روسی اس کے مخالف ہو وہ قرآن وحدیث کا مخالف ہو کر متروک القول قرار دیا جائے گا۔ پھر یہ کہ سامانِ حرب مسئلۂ تشبہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، اور یوں مسئلۂ تشبہ کی تحقیق نہ ہونے سے شبہ پڑ جاوے وہ اور بات ہے، بہر حال جس پر بقائے سلطنت موقوف ہے اس کو مسئلۂ تشبہ سے کوئی علاقہ نہیں، اور اگر مراد اس سے میز کرسی پر کھانا کھانا، مکانات میں تصاویر کا لٹکانا وغیرہا ہے تو اس کو بقائے سلطنت سے کوئی علاقہ معلوم نہیں ہوتا، بہر حال وہ نیا رنگ سمجھ میں نہیں آتا جس کو اہلِ فتویٰ حرام کہتے ہوں، اور سلطنت بدون اس کے قائم نہ رہ سکے۔

اور اگر واقع میں کوئی ایسا نیا رنگ ہے جو خلافِ شریعت بھی ہے اور بقائے سلطنت کا موقوف علیہ بھی ہے، اور پراگندہ روزی پراگندہ دل سے بچنے کے لیے اس نئے رنگ کو گوارا کیا جاتا ہے تو خود مخاطب عزیز تھوڑی دیر کے لیے حق جل وعلا شانہ کے تعلّقات وحقوق اور سلطنت وثروت کے فانی ثمرات کو میزانِ عقل وانصاف میں تول کر دیکھ لیں کس کا پلہ بھاری ہوتا ہے؟ میں پوچھتا ہوں: ڈکیتی قانوناً جرم ہے، لیکن اگر اسی قاعدے کی بنا پر کہ ہم ایسا قانون لے کر کیا کریں گے جس سے پریشانی ہو، اور مال کی تنگی ہو، برابر ڈکیتی کیا کرے، اور گورنمنٹ کی ناراضی کا مطلق پاس نہ کرے، اس شخص کے واسطے عقلاً کیا حکم کیا جاوے گا؟ کیا اس کے لیے ڈکیتی کو جائز کیا جاوے گا؟ وہ افلاس جو حاکمِ وقت کی خوشنودی کے ساتھ ہو، اس ثروت سے جو ارتکابِ جرم کے ساتھ ہو ہزار لاکھ درجہ افضل کہا جاوے گا، پھر تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدر گورنمنٹ کے برابر بھی نہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی ایسا وقت آوے کہ بلا کفر اختیار کیے ہوئے سلطنت قائم نہ رہ سکے تو مسلمان رہ کر مر جانا اچھا ہے یا کافر ہو کر زندہ رہنا؟ اور پھر آخری بات یہ ہے کہ اگر باوجود فسق وکفر کے تمام اقوام متفق ہو کر کسی خاص قوم کی سلطنت چھین لیں، اور فسق وکفر بھی آڑ نہ بن سکے تو اس وقت پراگندہ روزی پراگندہ دل کا کیا علاج ہوگا؟

عزیزِ من! مال وجاہ مقصود بالعرض ہے، مقصودِ اصلی رضائے حق ہے، اگر رضائے حق کے ساتھ ان دونوں کی حفاظت ہو سکے مضائقہ نہیں، ورنہ وہ دونوں کے روز کام آویں گے؟ اور پھر آخری انجام کیا ہوگا؟ کیا مریض کو بدپرہیزی سے روکنا گوارا نہیں ہوتا؟ کیا اس کا دل پریشان نہیں ہوتا؟ مگر اس عاقبت اندیشی کی وجہ سے نعمتِ صحت کو اس عارضی لذت بدپرہیزی پر ترجیح دی جاتی ہے، اور طبیب مشفق اس ناگواری وتنگی کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتا۔

اس کے بعد جو دوسرا نتیجہ نکالا کہ اسلام ہم کو حکومت اور سلطنت نہیں سکھلاتا، بلکہ ذلت اور دریوزہ گری سکھلاتا ہے، فی الواقع اسلام ایسی سلطنت نہیں سکھلاتا جس کا انجام نارِ جہنّم ہو، اور اگر ایسی سلطنت کی بھی اجازت ہو تو بس قیامت کے روز فرعون بھی عرض کر دے گا کہ مجھ کو تجربے

سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر میں خدائی کا دعویٰ نہ کرتا تو میری حکومت جاتی رہتی، لوگوں میں ذلت وخواری ہوتی، بقائے سلطنت کے لیے میں عمر بھر یہ دعویٰ کرتا رہا۔ کیا یہ عذر اس کا مقبول ہوگا؟

اور علی سبیل التنزل میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص نہایت عرق ریزی کرکے یہ بات ثابت کردے کہ بقائے سلطنت ضروری ہے، اور وہ بدون ارتکابِ معصیت کے ناممکن ہے، تو اس کی ضرورتِ بقا کو مان کر کہا جاوے گا کہ یہ مسئلہ اِکراہ کا ہے، شریعت نے اس کا قانون بھی مقرر کردیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض مجبوریوں میں ارتکابِ ظاہری کی اجازت ہوگی، مگر قلب سے کراہت ونفرتِ شدید ضروری ہے، کیوں کہ شرحِ صدر وطیبِ قلب کی تو کوئی ضرورت نہیں، نہ کسی مخلوق کو اس کا علم ہے جو اس شخص سے کراہتِ قلب پر مواخذہ دار وگیر کرسکے، غرض! پھر بھی مخالفتِ شریعت کی اجازت نہ ہوئی، جو مخالفتِ ظاہری ہوئی ہے وہ بھی قانونِ اتباع میں داخل ہوگئی۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ اگر ایسی مجبوری ہوگی تو سلاطین کو ہوگی، ہم عوام الناس کی کون سی حکومت وسلطنت ہاتھ سے نکلی جاتی تھی کہ ہم کو بھی ارتکابِ مخالفت کی ضرورت پڑی۔ غرض! سلاطین کی مجبوری ہمارے لیے مفیدِ مطلب نہیں ہوسکتی۔

اس کے بعد جو لکھا ہے کہ اگر سلطانِ روم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سا طریقہ اختیار کریں تو سلطنت نہیں کرسکتے، سو اول تو یہ حکم رجماً بالغیب قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ سلطنت نہیں کرسکتے، اگر کوئی شخص اس کے مناقض دعویٰ کرے کہ زیادہ خوبی کے ساتھ سلطنت کرسکتے ہیں تو اس کی تکذیب کی کیا دلیل ہے؟

اور اگر بالفرض مان بھی لیا جاوے جب بھی ہم کو مضر نہیں، کیوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریقے میں دو قسم کے امور ہیں، ایک وہ جو فرض وواجب ہیں، ان کی پابندی تو کسی حال میں مضرِ سلطنت ہرگز نہیں۔ دوسرے وہ جو شرعاً ضروری نہیں، مثلاً: رات کو گشت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ سو شریعت نے اس کا مکلّف ہی نہیں بنایا۔ غرض! جو امر شرعاً ضروری ہے وہ مضرِ سلطنت نہیں، اور جو مضرِ سلطنت سمجھا جاتا ہے وہ شرعاً ضروری نہیں۔ سو یہ دعویٰ کیسے ثابت ہو کہ فتویٰ شریعت پر عمل کرنے سے سلطنت نہیں کرسکتے۔

دوسرے شبہے کا جواب: اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ اس وقت ملک علم سے قائم ہے، شمشیر سے نہیں، اور اس کو بارود گولے کی ایجاد سے ثابت کیا ہے۔ عزیز من! اول تو جیسا بارود گولے کا علم ہے، شمشیر زنی کا بھی علم ہے، اور اگر شمشیر زنی کو علم نہیں کہا جاتا تو گولہ بازی کو علم کہنے کی کوئی وجہ نہیں، غرض یا تو پہلے زمانے میں بھی ملک کو علم سے قائم کہا جاوے گا، یا اس زمانے میں بھی علم کا دخل نہ مانا جاوے گا، پھر اگر یہ بھی مان لیا جاوے کہ وہ علم نہ تھا، یہ علم ہے۔ تو اس سے کیا مطلب حاصل ہوا؟ ان علوم کو کسی مفتی ہندی نے خلافِ شریعت بتلایا ہے، جس کی وجہ سے تنزل کا الزام فتویٰ علمائے ہند پر لگایا جاوے۔

تیسرے شبہے کا جواب: رہا یہ افسوس کہ مسلمانوں نے اللہ کی نعمتوں کی قدر نہ کی، اور بے قدری کی یہ دلیل کہ پانی سے وہ کام نہ لیا جس کے وہ شایاں تھا، بس پیاس میں پی لیا، وضو کیا، غسل کیا، طہارت کی، مخاطب عزیز کی خوش فہمی کے اعتبار سے نہایت تعجب خیز تقریر ہے، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وضو و غسل وغیرہ سے بڑھ کر وہ کام ہے جو اس سے اب لیا جارہا ہے۔ بس اس کے متعلق اتنا دریافت کرنا ہے کہ واقع میں یہ جدید صفتیں بہ نسبت وضو و غسل وطہارت کے زیادہ اہتمام کے لائق ہیں تو حق جل و علا شانہ نے حضراتِ انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے ایسے کم درجے کے فوائد تو کس اہتمام سے تعلیم فرمائے، اور ان صنائع سے ہزاروں سال تک اپنے بندوں کو اطلاع نہ دی، اس کی کیا وجہ ہے؟

دوسرے یہ کہ قیامت میں بقول مخاطب عزیز کے اُن لوگوں سے جب سوال بے ترکیبی کا غالبًا ہوگا جنھوں نے صرف طہارت و غسل وغیرہ میں پانی کا استعمال کیا تو ضرور ان لوگوں کے بڑے درجے ہوں گے جنھوں نے جدید صنائع میں کام کیا، گو ایک وقت بھی نماز نہ پڑھی ہو، گو عمر بھر جنابت وخباثت میں گزری ہو، کیوں کہ عملِ اعلیٰ کے روبرو عملِ ادنی کالعدم ہے تو اس بنا پر رات دن کی عبادت کرنے والے کندۂ دوزخ ہوں گے، اور فساق وفجار بلکہ کفار بھی نعوذ باللہ مقیم جنّت ہوں گے، کیا سچ مچ کسی حساب وکتاب کے اعتقاد رکھنے والے کا دل اس کو قبول کرتا ہے؟

چوتھے شبہے کا جواب: رہا یہ سوال کہ مسلمانوں نے اس طرف کیوں توجہ نہ کی، اس کو اصل مقصود سے کہ دعویٰ وجوبِ اتباعِ شریعت ہے کچھ تعلّق نہیں ہے، نہ آج تک کسی نے ان امور کو خلافِ شریعت کہا، پھر خواہ اس کی کچھ ہی وجہ ہو، بلکہ اگر ہم سستی وکاہلی ہی کو اس کا سبب قرار دے لیں، جیسا کہ مقصود سوال کا ہے تب بھی ہم کو اپنے اصلی دعوے سے کہ اتباعِ شریعت واجب ہے، دست بردار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے اس میں گفتگو کرنا محض لاحاصل ہے۔

پانچویں شبہے کا جواب: اس کے بعد مقاصدِ اسلام سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے، یہ اور زیادہ تعجب انگیز بات ہے، اسلام کے احکام ومقاصد تو اس قدر مشہور ومعروف ہیں کہ شاید مخالفین، ہندو ومنکرینِ اسلام بھی اس کو جانتے ہوں، گو کسی وجہ سے نہ مانتے ہوں۔

چھٹے شبہے کا جواب: رہا یہ امر کہ جس چیز کی طرف مسلمانوں کو بلایا جاتا ہے وہ اس سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ عزیزِ من! یہ شامت مسلمانوں کی ہے کہ اپنے مالکِ حقیقی کے احکام سے ایسے اجنبی ہو گئے ہیں تو کیا ان کی حالت متغیر ہو جانے سے اسلام کو چاہیے کہ اپنی حالت متغیر کر کے لامذہبی کا نام اسلام قرار دے دے، جس سے وہ مسلمانوں میں ضرور شمار کیے جاویں۔[۱]

یاد رکھنا چاہیے کہ احکامِ اسلام کی اس قدر کافی تکمیل ہو چکی ہے کہ قیامت تک اس میں تغیّر وتبدل نہیں ہو سکتا، جو کوئی اس کو مانے گا نجات ہوگی، نہ مانے گا خسرانِ ابدی میں مبتلا ہوگا، اگر تعلیمِ احکام کے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ لوگوں کے حالت سے اس کو بہت بعد نہ ہو تو پیغمبر ﷺ وجمیع انبیا علیہم السلام طوفانِ بے تمیزی کے زمانوں میں بت پرستی کو روکنے کیوں تشریف لائے تھے؟ حضرت نوح علیہ السلام بنصِ قرآنی ساڑھے نو سو برس تک اسی دُھن میں لگے رہے، اور کبھی یہ خیال نہ فرمایا، نہ من جانب اللہ ان کو حکم ہوا کہ تم ایسی چیز کی طرف کیوں بلاتے ہو جس سے وہ کوسوں دور نکل گئے ہیں، کفار کے نہ ماننے سے یہ نہ ہوا کہ اس کلمۂ توحید میں تخفیف ورعایت ہو جاتی، بلکہ منکرین کو عذابِ طوفان میں مبتلا کیا گیا، قرآن مجید کے صاف الفاظ میں یہ قصّہ

---

[۱] اگر کوئی شخص دہلی جانا چاہتا ہو، اور غلطی سے کلکتہ کی راہ ہو لے، جب دہلی سے سینکڑوں میل کا بعد ہو جاوے، کوئی شخص اس کو تنبیہ کرے کہ دہلی کا راستہ یہ نہیں ہے، تو کیا کوئی شخص اس مشورہ دینے میں حق پر سمجھا جاوے گا کہ اب تو دہلی سے بہت دور ہو گیا ہے اس طرف مت بلاؤ، کلکتہ کا نام دہلی رکھ کر اس میں جانے دو؟

مذکور ہے، پھر اس وقت میں اگر ایسی ہی بے تمیزی عام ہو جاوے تو کیا علما کو واجب یا جائز ہوگا کہ احکام میں تحریف کردیں؟ یا برابر اظہارِ حق کیے جاویں۔

ساتویں شبہے کا جواب: اور یہ جو لکھا ہے کہ جو باتیں ہمارے علمائے دین تعلیم کرتے ہیں، زمانہ موجود کی موافق ذلت اور خواری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا الخ اس کی نسبت اس قدر کہنا کافی ہے کہ جو کچھ وہ تعلیم کرتے ہیں، آیا موافق وحی کے تعلیم کرتے ہیں یا اپنی رائے سے؟ اگر کہا جاوے کہ اپنی رائے سے کرتے ہیں تو محض غلط ہے، اس واسطے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ برابر دعوے کے لیے آیت وحدیث پیش کرتے ہیں، پھر ہم کس طرح کہیں کہ اپنی رائے سے تعلیم کرتے ہیں، لامحالہ قائل ہونا پڑے گا کہ وہ تعلیم موافق وحی کے ہے، پھر یہ اعتراض کس پر ہوا؟ نعوذ باللہ یہ تو حضرتِ حق جلت عظمہ پر اعتراض ٹھہرا کہ ایسے احکام کیوں مقرر کیے جو اس زمانے میں موجبِ ذلت ہیں، پھر اس اعتراض کا جواب تو صرف علما کے ذمے نہیں، بلکہ ہر مسلمان کے ذمے ہے۔

اب اس کی اصلی وجہ سننا چاہیے کہ اتباعِ احکام سے اگر کسی وقت میں ذلت وخواری ہو تو آیا ان احکام میں کوئی فتور ہے یا کسی مخلوق کا قصور ہے۔ اس کے دریافت ہو جانے سے ہزاروں شبہات بلکہ تمام شبہات مٹ جاویں گے۔ اول: عزت وذلت عند الخلق کی حقیقت سمجھنا ضرور ہے، یہ دونوں صفتیں موجوداتِ حقیقیہ میں سے نہیں، بلکہ موجوداتِ اضافیہ میں سے ہیں، یعنی خلق کے علم واعتقاد میں کسی کی حالت کا عظیم ہونا یہ اس صاحبِ حالت کی عزت ہے، اور کسی حالت کا حقیر ہونا یہ اس صاحبِ حالت کی ذلت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ صفتیں اعتقاد وزعمِ خلق کے تابع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص برہنہ میلا کچیلا ایک معتقد کی نظر میں بہت بڑا ہے، اور دوسرے کی نظر میں محض رسوا وخوار ہے، جب یہ بات معلوم ہو چکی تو اب سمجھو کہ اسلامی حالت بھی موجبِ اعزاز اس شخص کی نظر میں ہو سکتی ہے جو احکامِ اسلام کو نظرِ عظمت سے دیکھتا ہو۔ بخلاف اس شخص کے جو خود اس کو ہی ایک امرِ لغو وبے کار سمجھتا ہو اس کی نظر میں وہی امر جو موجبِ عزت تھا موجبِ ذلت ہوگا۔ تو اس میں احکام کا کیا قصور ہوا؟ غلط بینی اس

شخص کی ہوئی جو اپنے عقیدے میں اس کو موجب حقارت سمجھتا ہے۔

اب انصاف کرنا چاہیے کہ اگر کسی کا اعتقاد یقیناً غلط ہو، اور وہ اس لیے اتباعِ احکام کو موجبِ ذلت سمجھتا ہے، تو کیا اس کے اعتقادِ غلط کا اتباع کر کے اس امر کو چھوڑ دیا جاوے گا؟ یا خود اس شخص کو غلط کار سمجھ کر اس امرِ حق پر استقامت و استقلال سے قائم رہا جاوے گا؟ سو اگر ایک شخص نے رشوت کو برا سمجھا، اور سود کو برا سمجھا، ناجائز نوکری کو برا سمجھا، اور گھاس کھود کر اپنا پیٹ پالا، اس نے عقل کی رو سے کیا برائی کی؟ پھر اس حالت کو حقیر سمجھنے سے کیا اس کو حق تعالیٰ کی مخالفت کر کے اللہ تعالیٰ کی نظر میں ذلیل بن جانا چاہیے؟

اندلس میں ایک زمانہ گزرا ہے کہ خود مسلمان رہنا ذلت کی بات تھی، اور بدون عیسائیت کے ہرگز آبرو و جان محفوظ نہیں رہ سکتی تھی، تو اب اس مقدمۂ خاص میں کیا ان لوگوں پر الزام ہوگا جنھوں نے اسلام پر قائم رہ کر آبرو اور ایمان جان سب قربان کر دی؟ یا ان ظالموں کا قصور قرار دیا جاوے گا جنھوں نے اس عزیز حالت کو موجبِ ذلت وغضب قرار دیا؟ کیا حضراتِ انبیا علیہم السلام کے ساتھ کفار نے کوئی دقیقہ نعوذ باللہ ایذا و اہانت کا اٹھا رکھا؟ کیا کھلم کھلا گالیاں نہیں دیں؟ کیا ان کو سنگ بار نہیں کیا؟ پھر انھوں نے ان ہی بہشت اور حوروں کی توقع میں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی تحصیل کے لیے کیوں اس ذلت واذیت کو گوارا کیا؟ افسوس ایسی موٹی بات میں فہیم لوگ غور نہیں کرتے۔

اور اگر قلتِ مال کا نام ذلت ہے تو چاہیے دنیا میں چور وقزاق جو بڑے مال دار ہیں نہایت معزز قرار دیے جاویں، اور ان حرام ذرائع کی نسبت جس میں آمدنی بالکل محدود ہے اس چوری وقزاقی کو ترجیح دی جاوے، چوری وقزاقی اسی لیے موجبِ ذلت ہے کہ قانونی جرم ہے، پھر اگر قانونِ الٰہی کے اعتبار سے کوئی چیز جرم ہو تو اس کو کیوں موجبِ اعزاز قرار دیا جاتا ہے؟ اچھا اعزاز بھی ہوا، لیکن بعدِ مرگ جب کشاکشی ہوگی تو کیا یہ دلائل اس وقت مقبول ومسموع ہوں گے؟ بس بات یہ ہے کہ کسی کو یہاں ذلت وہاں عزت، کسی کو یہاں عزت وہاں ذلت، اب اس میں ہر معتقدِ آخرت فیصلہ کر کے ترجیح دے سکتا ہے۔

آٹھویں شبہے کا جواب: اور یہ کہنا کہ جس طریقے سے علما بتلاتے ہیں دنیا بقدرِ ضرورت بھی حاصل نہیں ہوتی، بالکل غلط ہے، اور اس کے ثبوت کے لیے جو مثال فرض کی ہے کہ ایک شخص کو عالم بنایا، اب وہ کیا کرے إلخ سواول تو یہ کہتا کون ہے کہ ہر شخص عالمِ اصطلاحی بنایا جاوے، اہلِ تحقیق تو یوں کہتے ہیں کہ جس شخص کو اطمینانِ قلب میسّر ہو، خواہ کسی ذریعہ ظاہری سے، خواہ قوتِ توکل سے، وہ علمِ دین میں تکمیل کرے، اور عمر بھر خدمتِ دین میں مصروف رہے، اس کے حق میں تو یہ سوال ہی نہیں ہوسکتا کہ وہ کیا کرے۔ رہ گئے بے اطمینان وحریص وطماع لوگ ان کو چاہیے کہ بقدرِ ضرورت احکامِ دینیہ یاد کر کے اپنی معاش میں مشغول ہوں، اور وقتاً فوقتاً اہلِ علم سے اپنے واقعات وضروریات کے متعلق تحقیق وتفتیش کرتے رہیں، ان کے حق میں یہ سوال معقول ہے کہ کون سا کام کریں، سو یہ تو دل کھول کر بآوازِ بلند کہا جاوے گا کہ حرام کام نہ کریں، پھر مباح کام میں لوہار وبڑھئی اور تارِ برقی اور ریل سب کام برابر ہیں، اس کو کس نے منع کیا ہے؟ اگر کوئی شخص ان صنائع کی تعلیم کا اہتمام کرے، بڑی خوشی کی بات ہے، مگر ان سب کاموں کے لیے چاہیے روپیہ، جو اصلاح چاہتے ہیں وہ بے زر ہیں، جو زردار ہیں ان کو بجز اس کے کہ مسلمانوں کو وحشی اور بدتہذیب بتلائیں، اور ان کی وحشت اور بدتہذیبی کا علاج دہریت کو بتلائیں، اور کچھ آتا نہیں۔ خیر بہرحال! خواہ اس کا اہتمام کیا جاوے، یا نہ کیا جاوے، یہ خلافِ شرع کسی کے نزدیک نہیں۔

نویں شبہے کا جواب: اس کے بعد مدارسِ اسلامیہ پر اعتراض ہے کہ ہمارا یہ کام نہیں جو آیا پڑھا دیا، بلکہ وہ مفید طرز اختیار کریں جس سے ہمارے بھائیوں کو نفع پہنچے، یہ تشریح نہ کی گئی کہ اس سے نفعِ دنیوی مراد ہے یا نفعِ دینی؟ اور دنیوی نفع مراد ہے تو کیا صرف اسی کا حاصل کرلینا کافی ہے؟ اور کیا نفعِ دین کی احتیاج نہیں ہے؟ اور اگر نفعِ دینی مراد ہے تو کیا اس کے لیے تعلیم علومِ دینیہ کی حاجت نہیں، اور کیا مدارس سے یہ نفع حاصل نہیں ہورہا؟ یہ میں نہیں کہتا کہ اگر سو طالب علم پڑھتے ہیں تو ہر شخص ان میں سے ابوحنیفہ وغزالی بن جاتا ہے، مگر یہ بھی ضروری بات ہے کہ بہت سے ان میں کام کے بھی ہوتے ہیں، جن سے ہزاروں کو نفع پہنچتا ہے، جس شخص نے

تفصیلاً مدارس وفضلائے فارغین کا مشاہدہ کیا ہے اس کے نظر میں یہ امرِ محسوس ہے۔

اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس میں کوئی اصلاح کی ضرورت نہیں، بہت سی اصلاحوں کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر سستی یا قلّتِ سرمایہ سے یا اور کسی وجہ سے اس اصلاح میں توقف ہو تو کیا جتنا کام ہو رہا ہے اس کو بھی موقوف کر دیا جائے؟ پھر اگر ہمت کر کے کوئی یہی کہہ دے کہ ہاں موقوف کر دیا جاوے تو اس سے یہ پوچھا جاوے گا کہ پھر علومِ دینیہ کا بقا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر کہا جاوے کہ کچھ ضروری نہیں ایسے شخص سے تو خطاب ہی لا حاصل ہے، اس کو بجائے اس کے کہ ضرورت علمِ دین کی اس کی روبرو ثابت کی جاوے تجدیدِ اسلام کا مشورہ دیا جاوے گا، اور اگر ضروری ہے تو اس سلسلے کے بقا کا پھر کیا طریقہ ہے؟ ظاہر ہے کہ بجز تعلیم و تعلّم کے اور کوئی طریقہ نہیں، پھر مدارسِ عربیہ میں جس قدر ہو رہا ہے ثابت ہوا کہ وہ غنیمت ہے، اس کو بے کار وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کو اپنے افعال و اقوال کی نسبت یہ فکر نہ ہو کہ آیا یہ سب مرضیٔ حق تعالیٰ کے موافق ہیں یا مخالف، جب یہ فکر ہوگی اس کی تفتیش کے درپے ہوگا، اور تفتیش کے بعد ان لوگوں سے پتہ لگے گا جو پھٹی لنگی اور پیوند زدہ کرتہ پہنے ایک گھنٹہ چٹائی پر ایک بوسیدہ کتاب کے مطالعے میں مشغول ہیں، جب روز روز اس سے مشکلات حل ہوں گے جب سمجھ میں آوے گا کہ یہ جماعت کس کام کی ہے؟ اور اس کام کی کتنی ضرورت ہے؟ اور وہ ان ہی بے نظم مدارس سے چل رہا ہے، اور جس کو اس کی ضرورت نہ ہو واقعی اس کے نزدیک یہ سب قصّہ مہمل ہے۔

اور آگے جو قصّہ ایک خدمت گزار و معتقدِ علما کا لکھا ہے کہ وہ ضروری مسائل سے ناواقف تھا، سو اس میں علما کا کیا قصور ہے؟ یہ اس شخص کی بے توجہی ہے کہ اس نے کبھی کسی سے نہ پوچھا، اور بے پوچھے علما کس کس چیز کو بتلاتے پھریں؟ ان کی مثال طبیب کی سی ہے کہ کسی مریض نے کچھ شکایت کی، قارورہ و نبض دیکھ کر نسخہ لکھ دیا۔ ضروری کام تو ان کے ذمہ اسی قدر ہے، البتہ بعض ایسے عالی ہمت بھی ہیں کہ مسلمانوں کی حالت کی خود نگرانی کر کے ضروریات کی اطلاع دیتے ہیں، اس کا طریق وعظ گوئی ہے، سو دکان دار واعظین تو کسی شمار و قطار میں نہیں، محض جاہل ہیں، ان میں جو خیر خواہ و ہمدرد واعظ ہیں ان کے ساتھ حکام و رعایا کی طرف سے جو

معاملہ ہوتا ہے بجز انبیا واولیا کے اس کا کوئی متحمل نہیں ہوسکتا، اب کس برتے پر وعظ کہیں، سوائے اس کے کہ ایک گوشے میں بیٹھ جاویں، اور جو ان سے دریافت کرے جواب دے دیں، اور بیٹھے بٹھلائے خطرے میں پڑنا ہر شخص کی ہمت نہیں، نہ عقلاً ونقلاً کوئی اس کا مکلّف ہے۔

اس کے بعد علما کی حالت کو اصلاح کے قابل بتلایا ہے، میں اس کا بھی انکار نہیں کرتا، لیکن اگر شامتِ اعمال سے کسی عالم نے اپنی حالت درست نہ کی تو ان کا یہ کہنا تو غلط نہیں ہوسکتا کہ اتباعِ شریعت واجب ہے، ان کے اس قول پر تو عمل کرنا ضروری ہوگا، غایۃ ما فی الباب یہ کہ ان سے بھی کہا جاوے گا کہ تم کیوں نہیں عمل کرتے، یہ کیا وجہ کہ ان کی درستی کا انتظام کیا جاوے، اور اس کے بعد اپنی درستی کا وعدہ کیا جاوے، اپنی درستی کے لیے تو ان کا قول کافی ہے، اور اگر فعل ہی کی ضرورت ہے تو کیا تمام علما کے افعال نادرست ہیں؟ پھر ان کی تقلید کیوں نہیں کی جاتی؟ جب درستی کا ارادہ نہیں ہوتا ہزاروں حیلے نکل آتے ہیں، اور عازم درستی کے لیے ہر وقت درستی ممکن ہے۔

دسویں شبہے کا جواب: اس کے بعد ترمیمِ نصابِ تعلیم کو سند کے طور پر لائے ہیں کہ زمانے کے بدل جانے سے احکام بدل جاتے ہیں، اور اس سے کوٹ پتلون کا جواز ثابت کرنا چاہا ہے، عزیزِ من! تمام امور دو قسم پر ہیں: مقاصد اور ذرائع، مقاصد جو شریعت نے مقرر کردیے ہیں، آسمان بدل جائے، زمین بدل جائے، مگر وہ نہیں بدلتے، اور زمانے کے بدلنے سے تو وہ کیا بدلیں گے۔ ان احکام کا بدلنے والا ملحد وزندیق ہوتا ہے۔ رہ گئے ذرائع، وہ اصل میں ان مقاصد کی تحصیل کے لیے ہوتے ہیں، سو ممکن ہے ایک زمانے میں ایک مقصود کسی خاص طریقے سے حاصل ہوتا ہو، اس زمانے میں وہ طریق مطلوب ہوگا، دوسرے زمانے میں وہ مقصود دوسرے طریق سے حاصل ہونے لگا، اس لیے طریقِ اول کو چھوڑ کر دوسرا طریق اختیار کیا، بشرطے کہ دوسرا طریق کسی نص سے ممنوع الاستعمال نہ ہو، اس کی مثال یہ ہے کہ حج مقصود ہے، اور ہوائی جہاز میں سفر کرنا اس کا طریق، اب حج میں تو کسی مصلحت سے تغیّر نہیں ہوسکتا، مثلاً: حج ماہِ ذی الحجہ میں ہوتا ہے، کسی شخص کو محرم میں فرصت ہوتی ہے، اس کے لیے محرم میں

جائز ہو جاوے، یہ ناممکن ہے، اور طریق میں تغیّر ہو سکتا ہے، مثلاً: بجائے ہوائی جہاز کے اب دخانی جہاز چلنے لگا، اب پہلا طریق ترک کر کے دوسرا اختیار کرنا جائز ہے۔

جب یہ قاعدہ سمجھ میں آ گیا تو سمجھنا چاہیے کہ تحصیلِ علمِ دین مقصود ہے، اور نصابِ خاص اس کا آلہ اور ذریعہ، کسبِ حلال مقصود ہے، حرفت اور صنعت اس کا آلہ، سو زمانے کے بدلنے سے اگر نصابِ تعلیم بدل دیا جانا جائز ہو تو اس سے مقاصد کی تبدیل کا جواز لازم نہیں آتا، اور حرمتِ تشبہ بالکفار مقاصدِ شرعیہ میں سے ہے، قرآن وحدیث میں یہ مسئلہ مذکور ہے، سو جب تک کسی امر میں تشبہ رہے گا، وہ کسی زمانے کے بدلنے سے نہیں بدل سکتا، البتہ اگر کسی وقت میں کسی وجہ سے تشبُّہ ہی نہ رہے تو اب بہ وجہ اس کے کہ قانونِ تشبُّہ سے خارج ہو گیا، مباح ہو گا، تو باوجود اس تفاوت کے کوٹ پتلون کو نصابِ تعلیم پر کس طرح قیاس کرنا صحیح ہے۔

گیارہویں شبہے کا جواب: اور وہ کون سی بات ہوگی جس کو علما دس برس پہلے حرام بتلاتے تھے، اور اب اس کے جواز پر فتویٰ دیے جاتے ہیں، اگر وہ ذرائع میں سے ہے تو اس کی تبدیل کا قاعدہ ابھی معلوم ہو چکا ہے، اور اگر وہ مقاصد میں سے ہے تو اس میں ایسی تبدیل کوئی نہیں کر سکتا، اور اگر کسی نے ایسا کیا ہو، اس کی غلطی ہے، کسی کی غلطی سے قواعدِ شرعیہ نہیں بدل سکتے، عجب نہیں کہ تعلیمِ انگریزی اس سے مراد ہو تو جان لینا چاہیے کہ اس کو جس نے ممنوع کہا تھا یا اب بھی کہہ رہا ہے، نہ صرف زبان کی وجہ سے، بلکہ جو مفاسد اس کے ساتھ فی الحال مقرون ہوتے ہیں، یا آیندہ چل کر ہو جاتے ہیں، سو واقع میں ان مفاسد کو حرام کہنا مقصود ہے، سو وہ اب کون عالم ہوگا جس نے ان مفاسد کے جواز پر فتویٰ دے دیا ہوگا۔

بارہویں شبہے کا جواب: اس کے بعد علما پر گوشہ نشینی کا الزام لگایا۔ عزیزِ من! آپ کو خبر نہیں جس پیغمبر (روحي فداه) کا ہم کلمہ پڑھ رہے ہیں، اور آپ کی تصدیق ومحبّت کو جزوِ ایمان سمجھتے ہیں اور واقع میں یہی ہے آپ نے اس زمانے کی علامات بیان فرما کر بڑی تاکید اور زور سے مشورہ دیا ہے کہ گوشے میں پڑ کر، بلکہ جنگل میں کسی درخت کی جڑ دانت سے پکڑ کر اپنی جان دے دو۔ اور فرمایا ہے کہ:

''وہ ایسا زمانہ ہوگا جس میں صبح کو مسلمان، شام کو کافر، اور صبح کو کافر، شام کو مسلمان''

یہ حال ہو جاوے گا۔ اور فرمایا کہ:

''جب تم دیکھو کہ ہر شخص اپنی حرص کی اطاعت کرتا ہے، اور خواہشِ نفسانی کی پیروی کرتا ہے، اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے، اور ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے۔ تو بس تم اس وقت اپنا دین سنبھالو، اور عوام سے تعرض مت کرو''۔

عزیز من! ان علامات سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ وہ زمانہ یہی ہے، پھر علما نے کیا برا کیا جو گوشہ اختیار کیا۔

جو لوگ گوشوں سے نکل نکل کر ان فتنوں میں گھستے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو قوتِ ولایت عنایت فرمائی ہے تب تو خیر وہ سلامت رہتے ہیں، ورنہ اکثر لوگ دوسروں کی اصلاح میں خود بگڑ جاتے ہیں، جس طرح کوئی جلتی آگ میں کودے کہ دوسروں کو نکالوں گا، کچھ تعجب نہیں کہ خود ہی جل جاوے، اور بڑی وجہ اس کی یہی ہے کہ جن کی اصلاح کرتا ہے وہ خود اپنی اصلاح نہیں چاہتے، اس واسطے ادھر اثر نہیں ہوتا، اور یہ شخص بعض اوقات بہ امیدِ اصلاح ان کی ساتھ مداہنت ونرمی سے پیش آتا ہے، اور ان کے اقوال وافعال پر چشم پوشی کرتا ہے، شدہ شدہ خود اس کا دل ظلمانی ہو جاتا ہے، چناں چہ بارہا اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

پس جس حالت میں دنیا پرستوں کی یہ کیفیت ہے کہ علما کو اپنے رنگ میں ملانا چاہتے ہیں، اور خود ان کے رنگ میں نہیں آنا چاہتے، تو بتلاؤ کہ عبث تضیعِ اوقات وآوارہ گردی سے کیا نفع؟ بس اپنا ہی دین بچ جاوے تو غنیمت ہے، البتہ جو شخص خود درخواست اصلاح کی کرے، اس کی اصلاح کے لیے سب حاضر ہیں، جب تک توقع اصلاح کی باقی رہے، اور جب مایوسی ہو جاوے اس وقت بجائے وعظ ونصیحت کے حق تعالیٰ سے دعا والتجا ہدایت کی کی جاتی ہے۔

تیرہویں شبہے کا جواب: اس کے بعد تین اجزا دین کے لکھے ہیں: عقائد وعبادات ومعاملات، اور دو چیزیں رہ گئی ہیں، آدابِ معاشرت واصلاحِ نفس، خیر یہ سب چیزیں واقع میں اجزائے دین ہیں، مگر اس کے بعد جو لکھا ہے کہ اعتقادات کا کوئی نصاب نہیں، خدا جانے! اعتقادات

کے کیا معنیٰ سمجھ لیے ہیں، جو اس کے نصاب کی نفی کر دی، اعتقادات چند ومعدود چیزوں کی تصدیق کا نام ہے تو وہ سب چیزیں مفصّل طور پر جداگانہ کتب میں مُدَوَّن ومجتمع ہیں، اور ہر دعوے پر دلائل قائم ہیں، یہ خود مستقل علم ہے، عبادات ومعاملات کے تابع نہیں، جیسا مخاطبِ عزیز نے لکھا ہے۔ غرض! یہ جزو فہرستِ اجزا سے نہ گھٹ سکا، جس سے دینیات کا اختصار ثابت کرنا مقصود تھا، بلکہ یہ جزو سب اجزا سے بڑھ کر مہتم بالشان ہے، اور اس میں بڑے بڑے عقلا کو لغزشیں ہوئی ہیں، اور اسی جزو کے اندر اختلافِ بے جا کرنے سے بہتّر فرقے گمراہ پیدا ہوگئے، جن میں سے اس وقت ہندوستان میں معتزلیوں کی ترقی ہے، اور اکثر تصانیف ولیکچر اسی مذہب اعتزال سے مملو ومشحون ہیں، جن سے ہزاروں تباہ ہوتے چلے جاتے ہیں، بھلا! اتنی بڑی چیز کو کسی طرح نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا حصّہ عبادات کا ہے، جس میں آگے کلام آتا ہے، یہ بھی بہت بڑا حصّہ ہے، تیسرا حصّہ معاملات کا ہے، اس کو مخاطب عزیز نے تابعِ سلطنت قرار دے کر اس کی بھی صفائی کر دی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کے جزوِ دین ہونے کے معنیٰ نہیں سمجھے، معاملات کا واقع ہونا جزوِ دین نہیں، بلکہ واقع ہونے کے وقت صحیح ومطابق قواعدِ شرع کے ہونا یہ جزوِ دین ہے، اس میں سلطنت ہو یا نہ ہو، جب کوئی معاملہ مطابق شرع کے ہوگا صحیح ہوگا، اگر مخالف ہوگا فاسد ہوگا، یہ دونوں شرعی مسئلے ہر حال میں صحیح ہیں، اس میں سلطنت ومسکنت دونوں مساوی ہیں۔

آگے جو لکھا ہے کہ زنا سے سنگ سار نہیں ہوتے، چوری سے ہاتھ نہیں کٹتے، اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ معاملات خارجِ دین ہوگئے، یا جو کچھ اب ہو رہا ہے یہ سب جائز ہے، اس کا جو حکمِ شرعی تھا کہ رجم وقطعِ ید واجب ہے، وہ اب بھی بحالہ محفوظ ہے، خواہ قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اس پر مسلمان عمل نہ کر سکیں، اس میں عاصی ہوں یا معذور ہوں یہ دوسری بحث ہے، اس سے علمِ معاملات کا واجب التحصیل نہ ہونا کس طرح لازم آیا؟ علم دین کی تکمیل کے لیے تو اب بھی اس کے مسائل کا معلوم کرنا واجب وفرض ہے، اگر یہ شبہ ہو کہ پھر اس کا نفع کیا؟ سو نفع اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا علمِ صحیح ہو جاوے، یہ نہ سمجھے کہ اس میں سزائے جرمانہ وجیل کافی ہے۔

اس کے بعد جو صورت فرض کی ہے، وہ ذرا نازک ہے، مگر اس میں بھی کلام کرنا چاہتا ہوں۔ زنا کی نالش ایک دعویٰ ہے، اور عند الحاکم اس دعوی کے لیے گواہ کی ضرورت ہے، اور گواہ ہونے چاہییں چار، اور جو جو اس کی شرائط کتبِ دینیہ میں مذکور ہیں وہ سب مجتمع ہونا چاہیے، پھر خود اس کے صریح طور پر دیکھنے سے بھی احکام کا بھی فرق ہو جاتا ہے، اور اس عورت کی زوجہ وخواہر ومادر ہونے کی اعتبار سے بھی اختلافِ احکام ہو جاتا ہے۔

میں سب کی تفصیل[1] لکھتا، مگر بہ خوفِ تطویل سب کو حذف کر کے اتنا لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ فی الواقع جن صورتوں میں شریعت نے دعوے کی اجازت نہیں دی، دعویٰ کرنا حرام اور سخت معصیت ہے، اور اگر دعویٰ کیا، بلاشک یہ شخص معین ہوگا حکم مخالفِ شرع کا۔ رہا یہ شبہ کہ پھر کیا کرے؟ کیا خاموش ہو کر بیٹھ رہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اگر بالفرض اس کو کوئی گواہ معاینے کا میسّر نہ ہو، اور کوئی شخص جھوٹی گواہی پر رضا مند نہ ہو، تو اس وقت میں پوچھتا ہوں کہ یہ شخص کیا کرے؟ جو اس سوال کا جواب ہے، وہی عزیزِ مخاطب کے سوال کا جواب ہے، اور جس صورت میں دعویٰ کرنا جائز ہو بے شک دعویٰ کرے۔

رہا یہ امر کہ حکم قانونی خلافِ حکم شرع ہے، اور یہ شخص اس کا معین ہے، سو جو سزا اس میں قانون ہے وہ شرعاً تعزیر ہے، اور جو سزائے شرعی ہے وہ حد ہے، اور تعزیر بہ نسبت حد کے خفیف ہے، سو جو شخص اس مجبوری سے کہ اس کا پورا حق نہ ملے گا اپنا پورا حق چھوڑ کر جزوِ حق کا دعویٰ کرے، اور وہ اس کو دیا جاوے، تو اس مدعی کو کیوں گناہ ہوگا؟ اس نے کون سی مخالفت شریعت کی کی؟ جس شخص کے ہزار روپے کسی کے ذمہ واجب ہوں، مگر پانسو کی تو میعاد گزر گئی، اس لیے اس کے وصول سے مایوسی ہے، پانسو تازہ قرض تھا، اس کی ڈگری ہوگئی، تو اس صورت

[1] صریح نہ دیکھنے میں دعویٰ زنا کا جائز نہیں، البتہ دعوی اختلاط وارتباط کا ہوگا، اور اس کی سزا تعزیر ہے، جس میں سزائے قید وجرمانہ وجیل وغیرہ سب داخل ہیں، اور صریح دیکھنے میں جب کہ گواہ نہ ہوں اگر اپنی بی بی یا محرم شرعی کو دیکھے قتل جائز ہے، مگر دعویٰ ناجائز، اور اگر بی بی کی نسبت دعویٰ کرے گا تو لعان لازم آوے گا، یہاں لعان ممکن نہ ہوگا، دعویٰ مطلق جائز نہ ہوگا، اور دوسروں کو دیکھے تو نہ دعویٰ جائز نہ قتل وغیرہ جائز، البتہ بشرطِ قدرت مناسب تشدد یا فہمائش ونصیحت اس کا حق ہے۔

میں حاکم پر جو کچھ بھی الزام ہو مگر اس شخص پر کوئی معصیت نہیں، نہ اس نے کوئی مخالفت شرع کی کی، نہ مخالفت کی اعانت کی، مگر قطعِ نظر اس سب امور کے یہ علم دینیات سے خارج کیوں کر دیا جاوے، اگر تمام جہان بد پرہیزی کرنے لگے تو علمِ طب کا ایک حصہ اس بنا پر خارج کر دینا چاہیے کہ اس کے موافق کوئی عمل تو کرتا نہیں پھر کیا فائدہ؟

رہا یہ سوال کہ طالب علموں کو ان جرائم کی سزائے شرعی پڑھانے سے کیا فائدہ؟ اس کا ایک فائدہ تو اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ بدونِ تعلم و تعلیم کے بقائے علم ممکن نہیں، اگر یہ سلسلہ منقطع ہو جاوے تو قطعاً اس جزوِ دین کا علم مفقود ہو جاوے، پھر اگر کسی وقت اس کی ضرورت پڑے تو بتلانے والے کہاں سے آئیں گے؟ اور اگر ایسا ہی حذف کرنا ہے تو سب سے اول قرآن مجید میں اختصار کرنا چاہیے کہ سب علوم کی جڑ وہی ہے، کیوں کہ جب ان احکام پر عمل نہیں ہوتا تو پھر ان آیات سے کیا فائدہ، پھر خدانخواستہ اگر کسی موقع پر نماز روزے سے ممانعت ہو جاوے تو وہ آیتیں بھی کم کر دی جاویں کہ یہ سب بے فائدہ ہیں، پھر نعوذ باللہ اگر مسلمان رہنے کی اجازت نہ رہے تو وہ آیتیں بھی نکال دی جاویں کہ یہ بھی بے فائدہ ہے، غرض! اس طرح تو سارا اسلام اور قرآن سب بے کار ٹھہرتا ہے، الٰہی توبہ۔

اس کے بعد جو تنگ ہو کر مسلمانوں کو دعائے خیر دی ہے کہ اللہ میاں اس جہان سے ان کو اٹھالیں تو ان کی نجات ہو، عزیزِ من! آپ نے تو یہ طعن سے لکھا ہے، مگر اتفاقی بات ہے کہ قلم سے سچّا مضمون نکل گیا۔ واقع میں اس وقت اسلامِ خالص پر قائم رہنا اس قدر مشکل ہے، جیسا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

''ایسے زمانے میں اسلام پر قائم رہنا اس قدر دشوار ہوگا جیسے چنگاری کو مٹھی کے اندر بند کرنا''۔

اور اس لیے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''ایسے آشوب کے زمانے میں جو شخص دین پر عمل کرے گا اس کو پچاس صحابی کے برابر اجر ملے گا''۔

اور اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

''آج وہ زمانہ ہے کہ ظاہرِ زمین بطنِ زمین سے بہتر ہے، یعنی حیات، اور ایک وقت آوے گا کہ

بطنِ زمین ظاہرِ زمین سے بہتر ہوگا، یعنی موت''۔

کوئی شک نہیں اس فتنے کے زمانے میں اگر کوئی شخص اپنا دین لبِ گور تک سلامت لے جاوے اس نے بڑا کام کیا۔ یاالٰہی! مدد فرمائیو، ایمان پر خاتمہ کیجیو۔

اس کے بعد چھوٹے معاملات کو اردو کی کتابوں میں مقید اور عبادت کے باب کو نہایت مختصر کیا گیا ہے، جس طرح مخاطبِ عزیز نے علما پر بے خبریٔ واقعاتِ دنیا کا حکم لگایا ہے، اس مضمون سے مخاطبِ عزیز پر بے خبریٔ واقعاتِ دینیہ کا حکم لگایا جانا صحیح ہے۔ عزیزِ من! دین پر عمل کرنے والوں کی عبادات ومعاملات میں جو نئی نئی صورتیں روزانہ پیش آتی ہیں ان کا احصا وشمار کرنے کا قصد کیا جاوے ممکن نہیں، اور ہر صورت کے متعلق جداگانہ حکم، جب صورتیں خارج از شمار ہیں تو ان کے احکام اس قدر مختصر کیوں کر ہوسکتے ہیں؟ اس کی تصدیق کے لیے ایک ہفتہ یا ایک ماہ کسی فتویٰ نویس عالم کے خطوط کو دیکھا جاوے، ممکن ہے کہ اس میں بعض فضول سوال بھی ہوں، ان کو منتہا کر کے ضروری سوالات جو روز مرہ پیش آتے ہیں، منتخب کر کے ان ہی اردو کی کتابوں اور قرآنِ مجید کے رکوعِ صوم میں ان کے احکام ڈھونڈے جاویں، تب اس دعویٰ کی صحت یا غلطی معلوم ہو، اور یوں بلا تجربہ ومشاہدہ جو کچھ کہا جاوے قابلِ التفات نہیں۔

آں عزیز نے دس برس پر تعجب کیا، جس کا نام کمالِ علمِ دین ہے وہ تو پچاس برس میں بھی خاطر خواہ میسّر نہیں ہوتا، میری اس قدر عمر اس خدمت میں گزری ہے، مگر اب تک یہ مسئلہ مجھ کو معلوم نہیں، اور نہ کسی کتاب میں اب تک مجھ کو ملا، اور روز مرہ واقع ہوتا ہے کہ مسافر امام کے سلام کے بعد جب مقتدی کھڑا ہو کر نماز پوری کرے تو یہ تو معلوم ہے کہ فاتحہ نہیں پڑھتا مگر قومہ میں سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہ یا رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ کہے یا نہ کہے، بھلا کسی اردو کی کتاب یا قرآن مجید کے کسی رکوع میں سے یہ مسئلہ نکال تو دیا جاوے، اور اگر رائے سے جواب دیا جاوے تو ہر شخص کی رائے معتبر نہیں، جس شخص نے تمام اصول وفروع ودلائل ونظائر کو احاطہ کیا ہو اسی کی رائے بھی قابلِ اعتبار ہوسکتی ہے، سو یہ احاطہ سالہا سال میں جا کر نصیب ہوتا ہے، اب بتلاؤ کہ دس برس زائد ہیں یا کم۔

چودہویں شبہے کا جواب: اس کے بعد جو مسجد کا رستہ لینے والوں پر عیب لگایا ہے، سو جس نے مسجد تحصیلِ مال کے لیے سنبھالی، بہت بُرا کیا، شریعت اس کو بھی لتاڑتی ہے، اور اگر عبادت وعلم کے لیے ایسا کیا، اور رزق کو اللہ تعالیٰ کے ذمے سمجھا تو کیا برائی کی؟ حضورِ اقدس ﷺ نے بعد نبوت اگر مسجد نشینی نہیں کی تو کیا کیا؟ اور صحابہ سے ہدایا اور تحائف کیا قبول نہیں فرمائے؟ اور کیا آپ کو قرآن مجید میں یہ نہیں فرمایا:

﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْـَٔــلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ﴾ الآیة[1]

پھر اس میں عیب کیا ہوا، ساری بات یہ ہے کہ جو شخص ظاہراً ٹیپ ٹاپ سے رہتا ہے اس کے عیوب بھی موجبِ تحقیر نہیں ہوتے۔ اور جو شخص مسکنت غربت سے رہتا ہے اس کے ہنر بھی باعثِ تذلیل ہوتے ہیں۔ قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ مسجد نشینوں کے فتوحات جو من جانب اللہ عنایت ہوتے ہیں جس قدر لوگوں کی نظر میں حقیر وذلیل ہیں، کیا کسی بڑے عہدے دار کی رشوت کی کمائی اس قدر نظر میں حقیر اور ذلیل ہے؟ ہرگز نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اہلِ ثروت کا کفر وفسق نظر میں نہیں چبھتا، اور غریب مسلمانوں کی دین داری واطاعتِ خداوندی بے قدری کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، انا للہ۔

پندرہویں شبہے کا جواب: اس کے بعد کوٹ پتلون کی حکایت مذکور ہے، اور ٹوپی کی تبدیل کو قومی لباس بن جانے کے لیے کافی کہا گیا ہے۔ جس سے سخت حیرت ہے، اگر کوئی شخص زنانہ پائے جامہ، زنانہ کرتہ، زنانہ دوپٹہ پہنے، مگر سر پر امتیاز کے لیے ٹوپی بھی اوڑھ لے، کیا کوئی عاقل اس شخص کے لباس کو صرف ٹوپی کی وجہ سے مردانہ لباس کہہ سکتا ہے، بلکہ اگر تمام تر لباس مردانہ ہو، مگر ایک کپڑا صرف زنانہ ہو، جب بھی لوگ اس کو ہنسیں گے، حالاں کہ غالب حصّہ مردانہ لباس ہے، پھر اس کے عکس میں تو کیا ہونا چاہیے۔

اور یہ جو پیشین گوئی کی ہے کہ دس برس کے بعد منکرین کو بھی پہننا پڑے گا، سو اول تو بلا دلیل یہ پیشین گوئی مقبول نہیں، پھر اگر خدانخواستہ ایسا ہی ہوا تو اس وقت یوں کہو کہ یہ لباس

[1] سورۂ طٰہٰ: ۱۳۲۔

بہت عام ہوگا، اور جو خصوصیّت غیر اقوام کے ساتھ لباس کو ہے، جس خصوصیّت کی وجہ سے تشبہ کا حکم کیا جاتا ہے، یہ خصوصیّت جاتی رہے گی، جب خصوصیّت گئی تو تشبہ بھی گیا، پھر اگر مانع بھی پہننے لگے تو حرج کیا ہوگا، لیکن جب تک خصوصیّت باقی ہے، اور تشبہ حاصل ہے، حکمِ شرعی کس طرح اس پر متوجہ نہ ہوگا؟

اس کے بعد سواری میں اس لباس کی ضرورت لکھی ہے، سو میں اگر گھوڑے کی سواری جانتا تب تو اس کا عملی جواب دیتا، مگر افسوس کہ اب اس سے قاصر ہوں، لیکن اب بھی کئی شافی جواب رکھتا ہوں۔

اول: آں عزیز مدت سے گھوڑے پر خوب سوار ہوتے ہیں۔

دوم: بہت لوگ اسپ سوار دیکھے جو پچاس پچاس میل کا دورہ کرتے تھے، مگر یہ لباس ان کے پاس نہیں دیکھا، وہ کیوں کر سوار ہوتے ہیں؟

سوم: اگر یہ ہندوستانی کپڑا سواری میں جلد پھٹ جاتا ہے تو خدا کا فضل ہے، ایک پائے جامہ کی جگہ چار پائے جامہ بنالیے جاویں۔

چہارم: اگر کسی کپڑے کا پائے جامہ بنایا جاوے تو یہ بھی ممکن ہے کہ بشکلِ پائے جامہ ہندوستانی کے بنایا جاوے، ٹخنے بھی کھلے رہیں، پتلون بنانے کی کیا حاجت ہے؟

پنجم: اگر مان بھی لیا جاوے کہ بدون اس کے سواری میں تکلیف ہوتی ہے تو غایت سے غایت صرف ایک چیز کی ضرورت ثابت ہوئی بشرطے کہ ٹخنا ضرور کھلا ہو، وہ بھی ایک خاص وقت میں، اس کے علاوہ جو بہت سی چیزیں خلافِ شرع کمرے میں موجود ہیں، چناں چہ تصویر و باجہ وغیرہ اس کی کون ضرورت ہے؟ اسی طرح غیر وقت سواری میں اس لباس کی کیا حاجت ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ گشت سے فارغ ہو کر اس کو نکال دیا جاوے؟ اور پہننے کے وقت میں بھی اس کی کراہت و نفرت دل میں رکھی جاوے، اس طرح ضرورت بھی رفع ہوگئی، اور زیادہ مخالفت بھی شریعت کی نہ ہوئی، اس لیے کہ الضرورات تبیح المحظورات[1] خود مسئلہ شرعیہ ہے، مگر

[1] ضرورتیں ممنوع چیزوں کو مباح کر دیتی ہیں۔

اس کے ساتھ الضروري يتقدر بقدر الضرورة بھی حکم ہے، یعنی ضرورت سے جس چیز کی اجازت ہوئی ہے وہ حدِ ضرورت تک جائز ہوگی، مثلاً ضرورت مجوث فیہا میں اگر صرف پتلون سے ضرورت رفع ہو جاوے تو کوٹ جائز نہ ہوگا، جب صرف سواری کے وقت احتیاج ہے غیر وقت میں جائز نہ ہوگا، جب صرف استعمالِ بدنی کی حاجت ہے دل سے اس کو پسند کرنا جائز نہ ہوگا۔ دوائی تلخ جو بہ ضرورت استعمال کی جاتی ہے، کیا اس سے کوئی دل سے خوش ہوتا ہے؟ اگر وہ مکروہِ طبعی ہے تو یہ مکروہِ شرعی ہے، پھر اس میں کراہت ونفرت نہ ہونے کی کیا وجہ؟ اس طرح اگر استعمال ہو تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ عفو ہو جاوے۔

اور اس میں بھی بدون اس بات کے کہے رہا جاتا نہیں کہ اگر حاکمِ ضلع بالمشافہہ کسی خاص شخص کو بلا کر قطعاً کوٹ پتلون سے ممانعت کر دے اس وقت یہ عذر جو بمقابلۂ حکم شرعی کے پیش کیے ہیں حاکمِ مذکور کے روبرو پیش کرنے کی مجال ہو سکتی ہے، بھلا! حاکمِ حقیقی کے احکام کو اقل درجہ حاکمِ مجازی کے برابر تو سمجھنا چاہیے۔

سولہویں شبہے کا جواب: اس کے بعد جمع بین الصلاتین کا مسئلہ ذکر کیا ہے۔ عزیزِ من! اسی لیے علما کوشش کرتے ہیں کہ دینیات کا علم کافی ہونا ضرور ہے، ورنہ علم ناتمام سے خود رائی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ تو تحقیق کرنا چاہیے کون موقع پر فتویٰ دیا ہے؟ اور وہ موقع آں عزیز کو پیش آتا ہے یا نہیں؟ بتلاؤ: یہ قیاس اور رائے محض نہیں تو کیا ہے؟ افسوس ہے کہ کسی حاکم کے قانون میں بلا تحقیق اس طرح یوں ہی اٹکل قیاس کر کے کوئی عمل کر سکتا ہے، کوئی لفظ بھی مشتبہ ہوتا ہے تو اس کو جگہ جگہ دکھلاتے پھرتے ہیں کہ اس کا کیا مطلب ہے، اور اگر ہر جگہ جدا مطلب معلوم ہو تو جس میں سب سے زیادہ احتیاط ہو اس پر عمل کرتے ہیں۔ اور احکامِ خداوندی میں ایسی بے باکی کہ فتویٰ دوسرے موقع کا، اور اس کو جاری کر لیا اور جگہ، خیال کرنے کی بات ہے کہ بے پروائی کی بات ہے یا نہیں۔

اور ابوداود رحمۃ اللہ نے جو محدث ہیں حدیث نقل کر دی۔ محدث کا کام نقل کر دینا ہے، اس کا سمجھنا اور احکام میں تطبیق دینا یہ کام فقہا ومجتہدین کا ہے، سو تمام امت کا اس پر اجماع ہے

(اور اجماع حجّتِ قطعیّہ ہے مثل قرآن وحدیث کے) کہ بلاسفر ومرض جمع کرنا حرام ہے، اور نماز صحیح نہیں ہوگی، اور سفر ومرض میں بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں، اور جو نظیر میں نے اوپر قانونِ حکومت پر عمل کرنے کی لکھی ہے وہ اس مسئلہ میں امام صاحب کے قول کو ترجیح دینے کے لیے کافی ہے، اور جب کہ سفر ومرض میں بھی نہ ہو تو یہ جرأت کس طرح ہوسکتی ہے، خدا کے لیے اس کو ترک کرنا چاہیے، اس طرح نماز بالکل ذمے رہتی ہے، اور جتنی نمازیں اس قسم کی پڑھی ہیں تخمینہ کرکے ان کی قضا کرنا چاہیے۔

اس کے بعد معذرت نسبتِ اظہارِ شبہات کے لکھی ہے، یہ آں عزیز کی صلاحیت وسعادت مندی ہے، ورنہ مجھ میں نہ طبابت کی لیاقت ہے نہ علاج کی قابلیت، مگر محض خیر خواہی ودل سوزی سے جو کچھ بھی فی البدیہہ آیا میں نے لکھ دیا۔ اگر اب بھی کوئی شبہ ہو تو بے تکلّف پیش کیا جاوے، مگر جو بات ہو مربوط ہو، غیر مربوط مضامین سے کلام، پھر اس کا جواب بہت طویل ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہوئی اس تقریر کے بڑھ جانے کی کہ اکثر مضامین مدعائے اصلی سے محض زائد تھے، اور یوں جیسے مضامین ہوں گے ان شاء اللہ تعالیٰ برابر جواب دوں گا، اور جو مجھ کو معلوم نہ ہوگا اور کسی عالم کا پتہ بتلا دوں گا، اگر آں عزیز کو طلبِ حق دل سے ہوگی اور اپنی رائے میں احتمال غلطی کا ہوگا، تو ان شاء اللہ تعالیٰ حق واضح ہو جاوے گا، اور میں نے صرف یہی جواب نہیں لکھا، بلکہ برابر دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ غلطی سے نجات بخش کر ہدایت حق کی فرماوے، اللہ تعالیٰ قبول فرماویں۔

اس کے بعد جو نوکری کے متعلق استفسار کیا ہے، عزیزِ من! وہ ایک فرع ہے، مقدم درستی اصول کی ہے، اس لیے میں نہ ابھی اس نوکری کو جائز کہوں نہ ناجائز، بعد تشفّی واصلاحِ اصول کے ان شاء اللہ تعالیٰ جو کچھ اس میں میری تحقیق ہے ظاہر کروں گا، چندے مجھ کو مہلت دی جاوے، اور امورِ اختلافیہ کا فیصلہ کرلیا جاوے۔

سترہویں شبہے کا جواب: سب کے آخر میں جو شبہ خصوصیّت بعثتِ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطے اصلاحِ عرب کے لکھا ہے، اس سے رونگٹے کھڑے ہوگئے (یہ نہ سمجھیں کہ بس یہ جواب ہوگیا، جواب تو آگے لکھتا ہوں، مگر یہ اظہار ہے ایک طبعی حالت کا) عزیزِ من! یہ عقیدہ یہود کا

تھا، جس کی تردید قرآن وحدیث میں صاف صاف مذکور ہے، اور حضور کا عامہ خلائق کی طرف مبعوث ہونا منصوص ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾.[1]

اور ارشاد ہوا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ○﴾.[2]

اور حضور نے ارشاد فرمایا ہے:

بعثت إلى الخلق كافّة.[3]

اور حضور نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''جو شخص میری خبر سن لے خواہ یہودی ہو یا نصرانی، پھر وہ ایمان نہ لاوے، ضرور دوزخی ہوگا''۔

یہ تو قولی حجّت ہے۔ اب عملی دلیل سنیے! حضور نے قیصرِ روم، کسریٰ فارس ونجاشی حبشہ ومقوقسِ مصر کے پاس فرمانِ مبارک اسلام لانے کے لیے اور درصورت مسلمان نہ ہوتے کے اُن پر گناہ ووبال کے لکھ لکھ کر بھیجے، اگر آپ کی بعثت خاص ہوتی، آپ ایسا امر کیوں فرماتے، اب نصوص کے بعد اس میں کیا تردد ہوسکتا ہے کہ آپ جمیع خلق کی طرف مبعوث ہوئے۔

اب جو امور مخاطبِ عزیز کے اس خیال کے اسباب ہیں ان کی نسبت لکھتا ہوں۔

امر اول: وموجبِ شبہ: اس زمانے کے عرب اپنی زبان میں فصیح وبلیغ تھے، ان کے لیے قرآن زبانِ عربی میں نازل ہوا، جس سے ان کو یقین ہوا کہ وہ کلامِ بشر نہیں۔ فقط۔

عزیزِ من! اول تو علاوہ کلام اللہ حضور کے معجزات ہزاروں ہیں، جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے، اگر کلام اللہ کو نہ سمجھا کوئی حرج نہیں۔ پھر یہ کہ جب ایک قوم نے بعد ہزاروں مخالفت کے آپ کو مان لیا۔ دوسروں کے لیے صرف یہ امر کافی ہے کہ جو لوگ اس فن کے ماہر ہیں اور وہ مقابلے سے عاجز ہوگئے، ضرور یہ کلام معجزہ ہے، پس معجزہ قرآنی بایں معنی عام ہوگیا۔

امرِ دوم: موجبِ شبہ: تمام عمر جناب رسولِ خدا ﷺ اس قوم میں رہے، اور جب ان کی تکمیل

---

[1] سورۂ سبأ: ۲۸۔ [2] سورۃ الأنبیاء: ۱۰۷۔ [3] میں تمام مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

ہوگئی وفات فرمائی۔ فقط۔

میں کہتا ہوں: یہ کیا ضرور ہے کہ جو شخص جماعت کی اصلاح کے لیے بھیجا جاوے وہ ہر شخص کے پاس جایا کرے، ورنہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ عرب میں بھی جن بستیوں میں آپ تشریف نہیں لے گئے وہ بھی آپ کے دائرۂ نبوت سے خارج ہوں۔ اگر کہا جاوے کہ ملکِ عرب سب ایک ملک ہے، ہم کہیں گے: سب زمین عالم کی ایک زمین ہے، اگر آپ ہر جگہ تشریف نہیں لے گئے تو آپ کے فرمانِ مبارک تو جا بجا پہنچے، جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے، اور تکمیلِ عرب کے بعد وفات فرمانا یہ بھی کوئی حجّت نہیں، اگر کوئی حکیم مصلح کسی خاص بستی کی اصلاح کے لیے بھیجا جاوے، اور پچاس، سو لائق آدمیوں کی تکمیل کر کے اور باقیوں کی تکمیل ان کے حوالہ کر کے واپس چلا جاوے، کیا یوں کہا جاوے گا کہ بس جن کی تکمیل ہوئی ان ہی لوگوں کی اصلاح مقصود ہے؟ یا یوں کہیں گے کہ اصلاح سب کی مدِ نظر تھی، مگر بعض کی تکمیل سے سلسلہ تکمیل کا جاری ہو گیا، اس لیے اب رہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔

امرِ سوم: موجبِ شبہ: دیگر اقوام نے آپ کے قرآن کو اس بنیاد پر نہ مانا جس پر عرب نے مانا تھا، بلکہ ان لوگوں کو عرب نے بزورِ شمشیر زیر کیا، اور ان کو زبردستی مسلمان کیا الخ.

میں کہتا ہوں: قرآن مجید کا معجزہ عام ہونا اوپر ثابت ہو چکا ہے، سو جب حق واضح ہو گیا اس کی مخالفت عقلاً کسی کو جائز نہ ہوئی، اس لیے قانونِ اسلام نے مزاحم و مخالف کی قوت کو گوارا نہ کیا۔ اطاعت کی یہی دو صورتیں ہیں: اسلام یا جزیہ، یہ خود قانون اسلامی ہے، صحابہ کی ایجاد نہیں، قرآن وحدیث کے ماہر پر یہ امر مخفی نہیں، اور یہ امر گو ہمارے دعوے میں مضر نہیں، مگر بالکل خلافِ واقع ہے کہ زبردستی مسلمان کیا، صحابہ اول تبلیغ کرتے تھے، اور رفعِ شبہات و مناظرے کی اجازت دیتے تھے، اور وضوحِ حق کے بعد ترکِ مخالفت میں زبردستی بھی جو عقلاً جائز ہے، چناں چہ بعد ثبوتِ حکومت گورنمنٹ کے باغی کو سزا دینا بالکل درست و موافق عقل کے ہے، اور ترکِ مخالفت کی وہی دو صورتیں ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔

امرِ چہارم: موجبِ شبہ: بہت لوگوں کو آپ کے پیغمبر ہونے کی خبر نہیں ہوئی۔ فقط۔

میں کہتا ہوں: عمومِ بعثت کے لیے یہ ضرور نہیں کہ سب کو خبر ہو جاوے، بلکہ رحمتِ خداوندی سے اس میں یہ وسعت ہے کہ جس جس کو خبر ہوتی جاوے قبول کرتے جاویں، اور جس کو خبر نہ ہو وہ معذور ہے۔

امرِ پنجم: موجبِ شبہ: ہندوستان وامریکہ وافریقہ کی ہدایت کیا ہوئی فقط۔

اس کا جواب امرِ شبہ چہارم میں گزر چکا، میرا ارادہ اس میں زیادہ لکھنے کا تھا، مگر چوں کہ عمومِ بعثت کے دلائل بہت قطعی وصاف ہیں، اور شبہات مذکورہ نہایت ضعیف۔ اس لیے اختصار کیا گیا، اگر خدانخواستہ! یہ کافی نہ ہوں تو اس سے زیادہ لکھنے کو تیار ہوں۔

خط نصیحت آمیز جس کا ذکر خطبے میں ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بخدمت عالی مرتبت مجمعِ اخلاق والطاف سلمہم اللہ تعالیٰ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ہر چند کہ مجھ کو آپ سے صوری نیاز حاصل نہیں، مگر آپ کے اخلاق واوصاف سن کر غائبانہ تعلّق ہے، جس نے اس عرض کی جرأت دلائی، میری گم نامی وناشناسائی پر نظر نہ فرمائیں، بلکہ انظرو إلی ما قال، ولا تنظروا إلی من قال کو پیشِ نظر رکھیے۔ اب بنامِ خدا شروع کرتا ہوں۔

مکرماً! جہاں تک آپ کے مساعی وتصانیف کو غور کر کے دیکھا، یوں معلوم ہوا کہ آپ کو دو چیزیں مقصود ہیں: خیر خواہیِ اسلام، وخیر خواہیِ مسلمانان، خیر خواہی اسلام نے اس پر مجبور کیا کہ جو اعتراضات مذہبِ اسلام پر مخالفین کے ہیں ان کے جواب دیے جائیں، اور خیر خواہی مسلمانان اس امر کا باعث ہوئی کہ مسلمان جو حضیض تنزل (پستی) میں گرے ہیں ان کو ترقی پر پہنچایا جاوے، ان دونوں مقصودوں کے مستحسن ہونے میں کسی منصف کو کلام نہیں ہوسکتا۔ مگر صرف غور طلب یہ امر ہے کہ اس کے ذرائع اور وسائل کیا چیز ہیں؟ اس کی تعیین باعثِ اختلافِ خیالات جمہور اہلِ اسلام ہے۔

آپ نے اسلام کے اوپر سے اعتراض دفع کرنے کی یہ صورت ٹھہرائی کہ جو تحقیقاتِ جدیدہ ہیں ان میں کلام نہ کیا جاوے، بلکہ جس طرح بن پڑے اسلام کو اس پر منطبق کر دیا جاوے، اور منشا اس تجویز کا صرف یہ دلیل ہے کہ تحقیقاتِ جدیدہ مطابق واقع کے ہیں، اور اسلام غیر مطابق واقع کے نہیں، دوسرے مقدمے کے تسلیم میں تو کسی مسلمان کو گنجائش نہیں رہی، پہلا مقدمہ وہ محلِ کلام ہے، اس کی کیا دلیل ہے کہ سب تحقیقاتِ جدیدہ صحیح ہیں؟ تمثیلاً بعض امور کو پیش کرنا چاہتا ہوں، مثلاً: فلاسفہ کی تحقیق ہے کہ آسمان کوئی مجسّم چیز نہیں، بھلا اس کے صحت پر کون دلیل قائم ہے؟ اگر یہ رنگ جو نظر آتا ہے آسمان نہ ہو اس سے آگے بہت دور موافق

حدیثِ صحیح کے پانچ سو برس کی مسافت پر پہلا آسمان موجود ہو، اس سے آگے اور سماوات ہوں تو کون سی دلیلِ عقلی قطعی کی مخالفت لازم آتی ہے؟ مثلاً: ان کی تحقیق ہے کہ اصحابِ کہف اور یاجوج ماجوج اور جنّ موافق عقائدِ اسلام موجود نہیں۔ اس کی کیا دلیل ہے؟ اگر کہے کہ باوجود تلاش ملے نہیں، جنّ نظر نہیں آئے تو جہان میں کسی چیز کا نہ ملنا، نظر نہ آنا دلیل اس کے عدم کی نہیں ہوتی، امریکہ کا حال پہلے معلوم نہ تھا، سیاحانِ ارض کو پتہ نہ لگا تھا، اور معتبر اخبار سے ثابت ہوتا ہے کہ نئے نئے حصّے نکلتے آتے ہیں، تو کیا یہ مقامات اس وقت معدوم تھے؟

رہا یہ کہ جن شہروں کا نام مفسّرین نے لکھا ہے وہاں نہیں ملے، تو اول حق تعالیٰ میں قدرت ہے کہ باوجود یہ کہ انھیں مقامات میں موجود ہوں پھر محجوب کر دیے جاویں، چناں چہ عنقریب بحثِ معجزہ میں یہ مضمون آتا ہے، اور بعدِ تسلیم ان مقامات میں نہ سہی، اور کہیں ہوں، نصوص کی کیوں تاویل کی جاوے؟ مثلاً: فلاسفۂ جدید نے معجزاتِ انبیا کا انکار کیا اس وجہ سے کہ یہ خلافِ فطرت ہے، اس پر کون سی شافی دلیل موجود ہے جس سے نصوص کو مصروف عن الظاہر کیا جاوے؟

رہا یہ کہ خلافِ فطرت ہے اس فطرت کی ماہیت آج تک متعیّن نہیں ہوئی، جس سے کوئی قاعدہ منضبط ہو سکے، نہ یہ کسی دلیل یقینی سے ثابت ہوا کہ فطرت کے خلاف کیوں محال ہے، اگر فطرت کی حقیقت عادتِ الٰہی ٹھہرائے، اور دلیلِ استحالہ خلافِ فطرت یہ ٹھہرائے کہ عادتِ الٰہی وعدۂ فعلی ہے، اس کا خلاف مثل وعدۂ قولی کے محال ہوگا۔

سو اول تو ان دونوں مقدموں میں کلام ہے، کیوں کہ عادتِ الٰہی اول وعدہ نہیں، یہ امر دلیل طلب ہے، دوسرے عادت کے لیے یہی ضرور نہیں کہ ہر روز واقع ہوا کرے، بعض امور میں یوں ہی عادتاً ہو کہ گاہ گاہ واقع ہو جاتا ہو، اور معجزات اسی قبیل سے ہوں، اس سے استدلال کا جواب بھی ہو گیا۔

﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾[1]

[1] سورۂ روم: ۳۰۔

اور ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾[1]

یہ جب ہے کہ ان آیات کے وہی معنی تسلیم کر لیے جاویں جو آپ فرماتے ہیں، اور اگر دوسری توجیہ کی جاوے جیسا کہ مفسّرین محقّقین نے کی ہے، اور وہ توجیہ آپ کی تاویلات سے زیادہ بعید نہیں، اس وقت استدلال ہی صحیح نہیں، جواب کی کیا حاجت ہے، دوسرے یہ کہ ریل وتار برقی اور فوٹو گراف اور ٹیلیفون اور فون اور خاک وبلا کیا کیا ایجاد ہوا ہے، آپ انصاف سے فرمایے کہ اگر یہ چیزیں کسی نے نہ دیکھی ہوں، اور آپ کا قاعدہ کہ خلافِ عادت محال ہے، اس کے نزدیک مسلّم ہو تو وہ ان چیزوں کے وجود کا اس قاعدہ سے انکار کرے گا یا نہیں، ضرور انکار کرے گا، پس اگر وہ قاعدہ صحیح ہے تو آپ کو بھی ان چیزوں کا انکار ضروری ہے، بلکہ صانعِ عالم کا ماننا ضروری نہ ہوگا، اگر ان چیزوں کا وجود مسلّم ہے تو قاعدہ سے دست بردار ہونا ضروری ہے۔

اگر یہ شبہ ہو کہ یہ چیزیں تو مستند (الی الاسباب) ہیں، اور معجزہ تو بلاسبب ایک فعل ہو جاتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسبابِ دنیاویہ اختیاریہ للعباد میں انحصار اسباب کا کسی دلیل سے ثابت ہونا چاہیے، حق تعالیٰ کی مشیت اور حکم کتنا بڑا سبب ہے، اس کے سبب ہونے میں کیا خرابی عقلی ہے؟ پس ثابت ہوا کہ انبیا سے معجزہ ہر قسم کا صادر ہونا ممکن ہے، پھر کیوں نصوص کی تاویل کی جاوے؟

یہی حال دوسری تحقیقاتِ جدیدہ کا ہے کہ اکثر اس میں مخدوش اور مبنی بر تخمین وتقلید ہیں، البتہ اگر کوئی دلیلِ عقلی ایسی ہو کہ اس کے تمام مقدمات برہانی ہوں، یا مشاہدہ صحیحہ ہو، جس میں احتمال غلط فہمی کا نہ ہو، اور پھر کوئی نص ظاہراً اس کے مخالف معلوم ہو، اس وقت اس نص میں تاویل مناسب ضرور ہے، مثلاً: نصوصِ قرآنیہ سے ید اور وجہ وغیرہ حق تعالیٰ کے لیے ہونا ظاہراً معلوم ہوتا ہے، اور دلیلِ قطعی سے انتفائے اجزا ثابت ہے، ان لفظوں میں البتہ تاویل کی گئی، اور تاویل میں بھی یہ شرط ہے کہ موافق قواعدِ عربیہ وشرعیہ ہو، ورنہ وہ تحریف ہے، آپ کی تاویلات اولاً بلا ضرورت، جیسا اوپر بیان ہوا۔ ثانیاً قواعدِ عربیہ کی پابندی، نہ قواعدِ شرعیہ کی،

[1] سورۂ فتح: ۲۳۔

پہلے علما نے بھی ملاحدہ کے جواب دیے ہیں، مگر اس طرح کہ اول ان کی تحقیقات کو منہدم کیا، اور جس تحقیق کو بالکل صحیح پایا، اس جگہ مناسب تاویل کی۔

اسی جگہ سے معلوم ہوگیا کہ آپ نے جو اکثر احادیثِ نبویہ کو غیر معتبر ٹھہرایا ہے اس کی بھی کوئی دلیل نہیں، اگر دلیلِ مخالفت دلیلِ عقلی ہے تو معلوم ہو چکا کہ دلیلِ عقلی سے مراد دلیلِ قطعی ہے نہ کہ دلیلِ وہمی، ورنہ اس دلیلِ عقلی کی تعیین مشکل ہو جاوے گی، پس کون بعض عقل کو اس کا معیار قرار دیں گے، کیوں کہ عقول میں تفاوتِ فاحش ہے، پھر ہر شخص کی عقلی تحقیق جدا ہوگی، اور سب کو صحیح ماننا پڑے گا، اس میں تو اجتماعِ نقیضین والتقائے ضدین[1] لازم آوے گا، مثلاً: بطلیموس اور فیثا غورس حرکت وسکون زمین وآسمان میں مختلف ہیں، افلاطون وارسطو حدوث وقدمِ ارواح میں متخالف ہیں، پھر ایک کی تحقیق تو ضرور غلط ہوگی، ہرگاہ تحقیقِ عقلی کی غلطی بھی ممکن ہوئی تو آپ کو کیسے وثوق ہوا کہ آپ کی عقلی دلیل ایسی صحیح ہے کہ لابد نص میں تاویل ہی واجب ہے۔ معلوم ہوا ایسے کی عقل ان امور میں قابلِ وثوق نہیں۔ جن کی نبوت واخبار عن الواقع مسلم ہے ان کی خبر قابلِ اعتبار ہوگی، عقل کا کام اتنا ہی ہے کہ توحید ورسالت کہ اصولِ عقلیہ میں سے ہیں سمجھ لے، آگے فروع میں زمامِ اختیار بدستِ حاکمِ حقیقی اور اس کے خلیفۂ اعظم کو دے دیں۔

دیکھیے! جب سلطانِ وقت بعد تدبر وتفکر کے اپنے کسی حاکم کی معرفت کوئی قانون ملک میں جاری کرے، رعایا کو اس تحقیق کی تو ضرورت ہے کہ یہ سلطان ہے، اور فلاں شخص اس کا حاکم، تاکہ بے اصل منادی پر جو کسی نے براہِ بغاوت یا براہِ تمسخر شہر میں کردے عمل نہ کرلیں، اور جب دونوں امر محقّق ہوگئے تو اب اس قانون میں غور کرنا کہ ہماری عقل کے خلاف تو نہیں محض ناجائز ہے، اگر ایسا کیا اور اپنی عقل کا اتباع کرکے قانون کا انکار کیا یا تاویل بعید کی تو معذور نہ ہوگا، اور اگر یہ باب مفتوح ہو تو ملک میں قوانین کا جاری ہونا موت ہو جاوے، اور بغاوت عالم گیر ہو جاوے، یہی حال حاکمِ حقیقی کے قوانین کا سمجھنا چاہیے، اور اگر انکارِ حدیث

---

[1] ضدین کا جمع ہونا۔

اس بنا پر ہے کہ ان میں کسی قدر اختلاف ہے، سو اتنا غور فرما لیجیے کہ تواریخ واخبار میں اختلاف ہوتا ہے یا نہیں، ہرگاہ اختلاف موجود ہے۔ پھر چاہیے کوئی تاریخ وخبر معتبر نہ ٹھہرے، جیسے مؤرخین راویانِ اخبار کے معتبر ہونے کو دیکھ کر مان لیتے ہیں، اور اختلاف کو مضر تسلیم نہیں سمجھتے، ایسے ہی حدیث میں رواۃِ اسناد کے حالات اسماء الرجال سے تحقیق کر کے اس کے ساتھ یہی عمل درآمد کریں تو کیا حرج ہے؟

اس تقریر سے غالبًا آپ کے تمام خیالات کا جو باعث ایسی تحریرات کے ہوئے جواب ہو گیا ہے۔ علاوہ اس کے ہر کارے وہر مردے تحقیقاتِ دینیہ میں گفتگو کرنا اور لوگوں کا کام تھا۔ آپ اس جملے سے یہ نہ سمجھیے کہ میں آپ کے علم وعقل کا منکر ہوں، یہ بات نہیں، بلکہ اصل یہ ہے کہ ہر امر میں اس شخص کی وقعت وتاثیر ہوتی ہے جس سے اس کا پہلے سے اعتبار ہو، علمائے محققین کی تحقیقات مسلمانوں میں معتبر سمجھی گئی ہیں، اور وہ لوگ اس کام کو کم وبیش کر بھی رہے ہیں، وہ اس خدمت کے لیے کافی تھے، دوسرے یہ کہ ہر شئ کے لیے ہر زمانے میں اس کے مناسب لوازم وخواص وآثار ہوتے ہیں، اول تو ہر زمانے میں نہیں تو اپنے زمانے میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تحقیقِ مسائل کے لیے اتنی چیزیں ضروری ہیں: وہ شخص عالم مشہور ہو، متقی پرہیز گار ہو، یہی شغل زیادہ ہو، لوگ اس کو دین دار وفہیم سمجھتے ہوں، دنیا میں زیادہ آلودہ نہ ہو، اور جس شخص میں یہ صفات نہ ہوں اس کو اس میدان میں قدم نہ رکھنا چاہیے، کیوں کہ سعی لا طائل وجہدِ باطل ہے، سو جیسی حالت اس وقت آپ کی ہے ایسی حالت پر آپ کی کوئی تحقیق صحیح بھی ہوتی تب بھی سکوت فرمانا چاہیے تھا، کیوں کہ ایسی حالت میں بولنا اور بولنا بھی ایسا جو سارے جہان کے خلاف ہو بیٹھے بٹھلائے اپنے مسلمان بھائیوں میں تفرقہ ڈالنا ہے، جس کو آپ سب سے زیادہ ناپسند کرتے ہیں، اور تعجب ہے کہ اس تفرقے کے سببِ عظیم پر آپ غور نہیں فرماتے۔

یہاں تک تو خیر خواہی اسلام پر معروض کیا گیا، دوسرا امر مسلمانوں کی خیر خواہی اور ان کی ترقی کی تدبیرات کرنا ہے، اس کے مستحسن ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں کرتا۔ ہاں! اس کے متعلق جو تدابیر کی جاتی ہیں وہ البتہ غور طلب ہیں، خلاصہ تمام تر آپ کی کارروائیوں کا یہ ہے

کہ انگریزی میں اعلیٰ درجے کی لیاقت واستعداد حاصل کرکے بڑے بڑے عہدے اور حکام تک رسائی اور قوم میں وقعت حاصل کریں۔ میں اس میں زیادہ گفتگو کرنا کہ انگریزی پڑھنا بحالت کذائیہ[1] کیسا ہے؟ اور اس کا اثر کھلی آنکھوں مذہب پر کہاں تک پڑ رہا ہے؟ نہیں چاہتا کہ اولاً اس میں بحث طویل ہے، دوسرے علما سے تحقیق ہوسکتی ہے۔

صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ اول تو ترقی قومی انگریزی پڑھنے میں منحصر نہیں۔ میری رائے میں اگر ترقی وقعت مطلوب ہے تو ترقی مالی اس کا ذریعہ ہے، اس زمانے میں دیکھا جاتا ہے کہ علم وکمالات پر کسی کی بھی نظر نہیں الا ماشاء اللہ، عوام، میں حکام میں مال دار کا اعتبار ہے، اس کی عزت ہے، اس کو خطاب والقاب ملتے ہیں، اکثر مقاصد میں کامیاب ہوتا ہے، مجسٹریٹی وغیرہ عہدے بھی مل جاتے ہیں، مشورۂ حکام میں بھی شریک کیے جاتے ہیں، خواہ انگریزی ایک حرف بھی نہ جانتے ہوں، اور اگر ترقی مالی مطلوب ہے تو تجارت وصنعت سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ ہر شخص ہر وقت میں پیشہ ور وتاجر کا محتاج ہے، تعلیمِ انگریزی خواں فیصدی دس جمعیّت سے ہوں گے۔ اور اہلِ صنعت وتاجر فیصدی دس پریشان ہوں گے۔ اگر بجائے تعلیمِ انگریزی صنائع کی تعلیم کا اہتمام فرماتے تو قوم کو زیادہ نفع ہوتا۔

ثانیاً: اگر فرض کرلیا جاوے کہ ترقی قومی انگریزی تعلیم میں منحصر ہی ہو، سرکاری مدارس کیا کچھ کم تھے جو جناب کے مدرسے کی حاجت ہوئی؟ اگر یہ وجہ بتلائی جاوے کہ ان مدارس میں مذہبی خیالات خراب ہوجاتے ہیں اس لیے ایسے مدرسے کی ضرورت ہوئی جہاں مذہبی تعلیم بھی ہو۔ مکرماً! سچ کہتا ہوں، اور آپ بھی دل میں جانتے ہوں گے کہ سرکاری مدارس کے تعلیم یافتہ ایسے بدعقیدہ نہیں جیسے اس مدرسے کے اکثر تعلیم یافتہ ہیں، اگر نماز ووعظ کے انتظام کو آپ عذر پیش کریں تو یہ خوب جان لیں کہ جب تک آپ کے خیالات نہ بدلیں گے آپ کے متّبعین کی وہی کیفیت رہے گی۔

ثالثاً: یہ بھی فرض کرلیا جاوے کہ اس مدرسے کی ضرورت ہی ہے، اور اسی مدرسے سے

[1] یعنی موجودہ حالت۔

ترقی دین و دنیا کی ہوسکتی ہے تو اس صورت میں انصاف سے دیکھیے ترقی کے مستحق زیادہ کون لوگ ہیں، اُمرا یا غربا، امرا کو تو پہلے سے ترقی حاصل ہے، آپ کی مطلوب ترقی نہ سہی، مگر کسی قسم کی تو ہے جو ان کے لیے کافی ہے، ان کے لیے زیادہ اہتمام کرنا تحصیلِ حاصل کی قبیل سے ہے، البتہ غربا اس کے زیادہ مستحق تھے، غریب بچوں کو مدرسے میں داخل کیا جاتا، ان کے مصارف کی کفالت کی جاتی، ان کو تعلیم و تربیت کر کے معزز عہدوں پر ممتاز کراتے، ان کے دل سے دعا نکلتی۔ خیر! اگر قبولِ دعا کوئی چیز نہیں تو ان کے دلوں کو راحت تو پہنچتی، یہ تو آپ کے نزدیک بھی محمود چیز ہے۔ اب تو تحقیق ہوا ہے کہ غریب کا گزر وہاں مشکل ہے، پھر ہمدردیٔ قومی و خیر خواہیٔ مسلمانان کہاں رہی؟

پھر اُمرا نے پڑھ کر ترقی بھی کی تو اول تعلیم میں کس قدر صرف ہوتا ہے، خصوصاً جو لوگ کہ یہاں سے ولایت جاتے ہیں جو آپ کے نزدیک عین صلاح ہے، ان کا اس قدر صرف ہوتا ہے کہ اس رقم کا بڑا گاؤں آسکتا ہے، یا تجارت کر کے اس کا بڑا کارخانہ بن سکتا ہے، جس میں اس شخص کی استعداد کے قریب کے لوگ کارکن مقرر ہوسکتے ہیں، اس سے بھی قطع نظر کر لی جاوے تو مبلغ ترقی یہ ہے کہ بیرسٹر ہوگئے، یا کوئی حکومت مل گئی، اگر بیرسٹر ہیں تو انھوں نے ستانا شروع کیا، جو دو قومی بھائی لڑیں تو ہماری ضرورت رفع ہو، ان کی مراد پوری ہوئی، کسی نے ان کو مقرر کرنا چاہا تو ایک پیشی کے دو چار سو روپیہ علی قدر اپنے کمال کے اس سے فرمایا، اس نے کچھ کم کہا تو خفا ہو کر نکالنے کا حکم دیا۔ **صاحب الغرض مجنون** اس نے معذرت کر کے وہ رقم قبول کی، اور جہاں سے ہوسکا توڑ جوڑ کر بندوبست کر کے ان کا رومال بھر دیا، خدا کی قدرت! پہلی پیشی میں بحث تمام نہ ہوئی، دوسری تاریخ مقرر ہوئی، اس تاریخ میں بھی وہی رقم مانگی گئی۔ غرض! دو تین پیشیوں میں اس کا، اس کے اعزہ کا گھر لٹ گیا، بھلا! یہ کیا ترقی و ہمدردی ہے کہ دس گھر اجڑ کر ایک آباد کیا جاوے۔

اگر حکومت مل گئی تو عقائد پہلے سے خراب ہو چکے ہیں، قبر و حشر فسانہ بے معنی ہے، پھر خدا کا خوف کس لیے، تہذیبِ اخلاق میں یہ قوت ہرگز نہیں کہ امورِ مذمومہ سے روک سکے، یہ

برکت مذہب ہی میں ہے کہ بعض لوگ اپنے آقا کی ناخوشی سے، کوئی عذابِ قبر و دوزخ سے ڈر کر منہیات سے بچتے ہیں، سواس شخص کو مذہب مانع رہا نہیں، اخلاق میں یہ قوت نہیں، پھر ایسا شخص جو کچھ کرے، ظلم کرے، رشوت لے، ناحق فیصلہ کرے، پرانی عداوت نکالے، جو کرے تعجب نہیں۔ ایک عاقل نے کیا خوب کہا ہے کہ جو شخص اپنے مذہب کا پابند نہ ہو وہ لائق حکومت کے نہیں، اور اگر کسی کے اخلاق ایسے ہی مہذّب ہو گئے ہوں جو سب امور سے مانع ہو جاوے تو یہ شاذ و نادر ہے، والنادر کالمعدوم، بہرحال! جو کارروائی مسلمانوں کی ترقی کے لیے اس وقت ہو رہی ہے وہ سراسر خرابی درخرابی سے بھری ہوئی ہے، پس نہ خیر خواہیٔ اسلام کے اصول صحیح ہیں، نہ خیر خواہیٔ مسلمانان کے ذرائع راست ہیں۔ یہ تو مجملاً ان امور کا ذکر تھا جن کا اثر دوسروں کو پہنچتا ہے۔

اب جو امور آپ کی ذاتِ خاص سے تعلّق رکھتے ہیں ان کو بھی بطورِ نمونہ کے پیش کرتا ہوں، سب سے اول عقائد کی درستی ہے، اگر کچھ شبہات انسان کو واقع ہو جاویں تعجب نہیں، مگر خدا کے فضل سے اس زمانے میں اہلِ علم محققین جامعِ معقول ومنقول شبہات رفع کرنے والے موجود ہیں۔ اقل درجہ مولانا محمد علی صاحب تحصیل دار مرحوم کی تحریرات میرے نزدیک آپ کے اصولی وفروعی شبہات کے جواب کے لیے کافی ہیں۔ اصرار کو کام نہ فرمایئے، نظرِ انصاف سے اس کو دیکھ کر اپنے خیالات درست فرمالیجیے، اور یہ خیال نہ فرمایئے کہ آپ اپنی مشہور تحقیقات کے کس طرح خلاف کہیں، آپ کی انصاف پسند طبیعت پر اس خیال کا احتمال نہیں۔ آپ نے بہت سی غلطیوں کا اقرار بھی فرمایا ہے مثلاً: حدیثِ فاطمہ میں فجاءت فاطمة وهي جويرية کا فجاءت فاطمة هي وجويرية لکھا گیا۔ پھر آپ نے نہایت انصاف وخوبی کے ساتھ اس سے رجوع کر کے طبع کر دیا، اگر اب بھی اپنے خیالات کو صحیح کر کے اعلان فرما دیجیے تو آپ کا اعلیٰ درجہ کا کمال ظاہر ہو۔ جمہور اہلِ اسلام کہ وہ تعداد میں آپ کے مدعیان اتباع سے بہت زیادہ ہیں آپ کے محبّ ومخلص بن جاویں، اس وقت ان کو ترقی کی تدبیرات جو بتلاویں وہ قبول کرنے کو دل سے تیار ہوں، اور آخرت میں ثواب ملے اپنے صحتِ عقائد کا

بھی، اور بہت سے لوگوں کے محفوظ رہنے کا، اور بعضوں کے عقائد درست ہو جاتے کا بھی، جو غایتِ محبّت واعتماد سے آپ کے رجوع کرنے سے وہ بھی رجوع کر لیں۔

دوسرے: نماز کی پابندی جماعت کے ساتھ ضرور ہے، خود نماز کی پابندی فرض ہے، اور جماعت سنتِ موکدہ، اللہ ورسول کی محبّت جو مقتضا اسلام کا ہے وہ اسی کو مقتضی ہے کہ نہ فرض چھوڑے نہ سنت۔ تیسرے: اصلاحِ لباس میں، میں زیادہ دلائل بیان نہیں کرتا، صرف ایک مختصر سی بات کہتا ہوں کہ مرد اگر عورت کا لباس پہن لے تو کیوں معیوب ہے، اسی وجہ سے ایک مذہب کی ایک قوم دوسرے مذہب کے لوگوں کا لباس ووضع اختیار کریں تو کیا بے موقع نہیں؟ چوتھے: حق تعالیٰ نے آپ کو ہر قسم کی استطاعت دی ہے، حج بنصِ قرآنی فرض ہے، خدا اور سول کی محبّت کا یہ مقتضا تھا کہ اگر فرضاً اسلام میں حج کی حاضری فرض وسنت بھی نہ ہوتی تب بھی بہ اقتضائے محبّت دربارِ خدا ودربارِ رسول میں ہر استطاعت والے کو حاضر ہونا ضرور تھا، نہ کہ حاضری مکّہ کی فرض اور حاضری مدینہ طیّبہ کی سنت، پھر کس قدر نازیبا ہے کہ عمر میں ایک بار بھی تشریف نہ لاویں، جس وقت لندن کا سفر کیا تھا ذہاباً یا ایاباً[1] اگر عدن سے سیدھے تشریف لے آتے تو کیا مشکل تھا؟ اب ہمت کیجیے، اور سامانِ سفر کر دیجیے۔ اور روزہ وزکاۃ ایک مخفی عبادت ہے، مجھ کو اس کی اطلاع نہیں، خدا کرے آپ پابند ہوں، ورنہ وہ بھی فہرستِ معروضاتِ بالا میں منسلک سمجھے جاویں۔

خلاصہ تمام معروضات کا یہ ہے کہ اب آپ کا اخیر وقت ہے، بجز عقائد واعمال کے کوئی اس سفر آخرت کا ساتھی نہیں، اپنے چند روزہ رفقا کو رخصت کیجیے، خواہ ظاہراً بھی، خواہ صرف دل سے، اور اس دائمی رفیق کو ساتھ لیجیے، یعنی عقائد واعمال کی اصلاح فرمائیے، کیوں کہ ﴿اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ﴾۔[2]

نسیم جاگو کمر کو باندھو
اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

[1] جاتے ہوئے یا آتے ہوئے۔ [2] سورۂ یونس: ۴۹۔

آخر میں یہ عرض ہے کہ اس التماس نامے میں اگر کوئی لفظ خلافِ مزاج سامی سرزد ہوا ہو، مزاج ناشناسی پر حمل کر کے معذور سمجھیں، تعصّب وعناد پر محمول نہ فرماویں کہ بخدا باعثِ تحریر صرف خیر خواہی ودل سوزی ہے، اور عرض ہذا اگر مقبول خاطرِ عاطر ہو، اور امید ہے کہ ہو تو اس نیاز مند کو مطلع فرما کر مسرور کریں، ورنہ کچھ حاجت تحریر جواب نہیں، زیادہ نیاز۔ فقط

تتمۂ اصلاح الخیال

حامداً ومصلیاً، اس مجموعے کی ترتیب کے بعد عزیز مذکور فی الخطبہ کا اس شخص ناصح کے پاس دوسرا خط آیا، اس میں بھی کچھ شبہات تھے، اس کے جواب میں بھی چوں کہ ازالہ ان شبہات کا تھا اس لیے اس مکاتبہ کو بھی اس میں شامل کر دیا گیا۔

خطِ عزیز

اٹھارہویں شبہے کی تقریر: میں مدت سے جناب کے خط کا جواب لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں، مگر عدیم الفرصتی سے آج تک کامیاب نہیں رہا، بہت مرتبہ ارادہ کیا کہ مختصر عرض کر دوں، لیکن جی چاہتا تھا مفصّل لکھنے کو، لیکن جب اس کا موقع نہ ملا تو آخر کار آج بالاختصار عرض کرنے میں اس وجہ سے جلدی کی کہ مدت گزر جانے سے مبادا یہ خیال پیدا ہو کہ ترکِ خط وکتابت کا باعث تحریراتِ سابقہ ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ میں آپ کو پورا اطمینان دلاتا ہوں کہ میں دینِ اسلام پر قائم ہوں۔ اس کو بہترین ادیان سمجھتا ہوں۔

انیسویں شبہے کی تقریر: اللہ کی توحید میں مجھ کو کوئی شک نہیں، اور اس کا میں نہایت شدت سے پابند ہوں، اور چوں کہ توحید کی نعمت ہم کو ہمارے پیغمبر نے تعلیم فرمائی، اور آپ کی بدولت یہ نعمتِ عظمٰی ہم کو میسّر آئی، لہٰذا میں ان کو نبی برحق جانتا ہوں۔ رہا یہ کہ وہ اللہ کے معشوق ہیں، اور انھیں کی وجہ سے کائنات پیدا ہوئی، اور اللہ تعالیٰ اور پیغمبر میں صرف ایک میم کا فرق ہے، یہ

میرے عقیدے نہیں ہیں، میرا آپ کا عقیدہ وہی ہے کہ جیسا قرآن میں ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ﴾[1] یہاں تک متعلق ایمان کے ہے جو بحمد اللہ میں اپنا درست پاتا ہوں، اور اس کا سوائے میرے اللہ کے کوئی واقف کار نہیں ہوسکتا۔

بیسویں شبہے کی تقریر: آگے وہ چیز لیجیے جس کا نام دین ہے، پانچ وقت کی نماز کا حکم لیجیے کہ اللہ کی کیا کیا مصلحتیں ہیں، ان کو استدلالی طور پر سمجھا ہوا ہوں، اور جانتا ہوں کہ اس سے بہتر طریقہ اپنے خالق کی عبادت اور شکر گزاری کا نہیں ہوسکتا، اور ہر شخص کو اس کا پابند رہنا چاہیے۔

اکیسویں شبہے کی تقریر: حج اور زکاۃ میں مجھ کو کوئی خدشہ نہیں، البتہ روزوں میں دو ایک باتیں شبہ کی ہیں، وہ یہ نہیں کہ اس کے فرض ہونے میں کوئی شک ہے، بلکہ رمضان کی تخصیص میں، سو مَیں کوشش کررہا ہوں کہ اس کی بابت میرا اطمینان ہوجاوے، میں مخالف راہ کو مستحکم کرنا نہیں چاہتا، بلکہ موافق کو۔

بائیسویں شبہے کی تقریر: اب رہ گیا لباس وغیرہ اس کی طرف تو میرا کبھی ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں جاتا کہ اس کو بھی کچھ ایمان یا دین یا مذہب میں کچھ دخل ہے، جب ہم سچے دل سے عقائدِ اسلامی رکھتے ہیں، بس دنیا میں ہم کو معزز ہوکر رہنا چاہیے، اور اس کے لیے جو طریقہ مناسب ہو استعمال کرنا چاہیے، بشرطے کہ وہ مخلِ عقائدِ اسلامیہ نہ ہو، میں انگریزی کپڑے پہننا بہ مقتضائے زمانہ صرف اتنا ہی ضروری سمجھتا ہوں جیسا کہ پیشاب پاخانہ کی حاجت، یعنی آدمی یہ کوشش کرتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو پاخانہ سے نکلوں، یہی حال میرا ہے کہ گھر واپس آن کر ایک لحہ بھی گوارا نہیں ہوتا کہ اس لباس میں رہوں۔

تیئیسویں شبہے کی تقریر: اپنے بچہ کی تعلیم کی بابت جو میرا خیال ہے وہ یہ ہے کہ میں اس کو عربی پڑھاؤں، اور ختمِ قرآن پر اس کو قادر کردوں، اس کے بعد علومِ دنیوی اس کو سکھلاؤں، اگر ان سب باتوں پر بھی آپ کو میری طرف سے کچھ خدشہ ہو تو میں کچھ عرض نہیں کرسکتا۔ اب

[1] سورۂ کہف: ۱۱۰۔

دوسری بات یہ ہے کہ مجھ کو مسلمانوں کی تعلیم پر جو مدارسِ عربیہ میں دی جاتی ہے سخت اعتراض ہے۔ اگر آپ کو اس کی اصلاح منظور ہو تو اس میں تحریر کا سلسلہ جاری رکھیے، میں اپنی معلوماتِ دنیوی سے آپ کو اس میں مدد دوں گا۔

چوبیسویں شبہے کی تقریر: میں سچ کہتا ہوں کہ مسلمان عنقریب ڈوبنے والے ہیں، اور بہت قریب ہے وہ زمانہ کہ مسلمانوں کا دین اور دنیا دونوں غارت ہوا جاتا ہے، اور یہ نتیجہ ہوگا اسی بے تکی تعلیم کا جو اس وقت مسلمانوں کو دی جاتی ہے، میں نے جو کچھ اپنے عقیدے میں تزلزل ظاہر کیا ہے میں اس کو واقعی اچھا سمجھتا ہوں، کیوں کہ یہ تزلزل میری تفتیش کا باعث ہے، اور جس آزادی کے ساتھ میں نے اس کو عرض کر دیا ہے اس طرح کا بیان منافقت سے دور ہے۔

۲۸ / جون ۱۹۰۱ عیسوی

جوابِ ناصح

اٹھارہویں شبہے کا جواب: مجھ کو توقفِ خط سے قلق ضرور تھا، سو بحمد اللہ تعالیٰ آج وہ رفع ہوگیا۔

انیسویں شبہے کا جواب: توحید و رسالت کے متعلق اپنے جو عقائد لکھے ہیں وہ نہایت صحیح ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر قائم رکھیں۔ البتہ رسالت کے متعلق ایک بات تصریح سے رہ گئی، وہ یہ کہ اگر آپ کی رسالت و بعثت کو عام مان لیا ہے تو صحیح ہے، اور اگر صرف عرب کے ساتھ خاص اعتقاد کیا جاتا ہے تو یہ بالکل غلط ہے، اور قرآن حدیث کے خلاف، اور نجات کے لیے یہ اعتقاد خصوصیّت کے ساتھ کافی نہیں ہے، باقی اللہ تعالیٰ کا معشوق ماننا اگر معشوق بمعنی محبوب ہو تب تو ضروری بات ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں، قرآن مجید سے جابجا ثابت ہے کہ اچھوں سے اللہ تعالیٰ کو محبّت ہے، پھر آپ تو سب اچھوں سے اچھے ہیں، آپ سے کیوں نہ محبّت ہوگی، اور اگر معشوق کے وہی معنیٰ ہیں جو شاعروں کے دماغ میں پکے ہوئے ہیں، سو واقعی وہ واجب الاعتقاد کیا بلکہ جائز الاعتقاد بھی نہیں، میم کا فرق یہ اسلامی عقیدہ نہیں، محض بے تکی بات ہے، اور کبھی تاویلِ بعید سے صحیح ہو جاوے اور بات ہے۔ بہر حال! یہ عقیدے سے کچھ تعلّق نہیں رکھتا، اور کائنات کا آپ کی وجہ سے پیدا ہونا یہ مضمون فی نفسہ صحیح ہے، مگر چوں کہ وہ روایت قطعی نہیں اس لیے وہ داخلِ عقائدِ ضروریہ نہیں۔

بیسویں شبہے کا جواب: اس کے بعد جو دین کو صرف نماز و روزہ و حج و زکاۃ میں منحصر کر دیا ہے، اس سے مراد اگر ارکانِ دین ہیں تو صحیح ہے، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ احکامِ دین صرف یہی ہوں، اور اگر احکامِ دین مراد ہیں تو یہ حصر غلط ہے، دین میں ہزاروں احکام ہیں جو بعض فرض ہیں، بعض واجب، بعض سنت، چناں چہ اہلِ علم پر پوشیدہ نہیں۔

اس کے بعد جو لکھا ہے کہ:

''نماز کی مصلحتیں میں استدلالی طور پر سمجھے ہوئے ہوں''۔

یہ بات جھگڑے کی نہیں، مگر استدلالی طور پر فروع کا سمجھنا ہی محلِ خطر ہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ مذہب کے اصول ہمیشہ عقلی واستدلالی ہوتے ہیں، اور فروع نقلی وشرعی ہوتے ہیں، اس میں جو مصلحتیں نظر آتی ہیں وہ مرتبۂ حکمت میں ہوتی ہیں، درجۂ علت میں نہیں ہوتیں کہ ان پر مدار ان احکام کا ہو، ان مصالح کو علت سمجھنے میں ہمیشہ اندیشہ ہے کہ جب کسی وجہ سے رائے میں تبدیل واقع ہو جاوے اصل حکم کا انکار مستبعد نہیں، اور نہ ہم کو فروع کو دلائلِ عقلیہ سے سمجھنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ جب نبوت عقلی دلیل سے ثابت ہوگئی، نبی کے سب احکام من جانب اللہ ہوتے ہیں، اور من جانب اللہ جو امر ہو وہ درست اور بجا ہوتا ہے اس دلیلِ اجمالی میں کفایت ہے، تفصیلی دلائل کی حاجت نہیں، البتہ اصول کو عقلی نہ کہنے سے محالات لازم آتے ہیں جن کی تفصیل طویل ہے، البتہ فروع میں یہ بات ضروری ہے کہ کسی دلیلِ عقلی قطعی کے خلاف نہ ہوں، اگر کوئی شخص خلاف ہونا ثابت کر دے گا تو صاحبِ مذہب کے ذمے اس کا جواب ضروری ہوگا۔

اکیسویں شبہے کا جواب: اس کے بعد جو تخصیصِ رمضان میں شبہ کیا ہے کہ

''میں اطمینان کی کوشش کر رہا ہوں''۔

معلوم نہیں اطمینانِ شرعی مراد ہے یا عقلی، اگر اطمینانِ شرعی مراد ہے تو دلائلِ شرعیہ قطعیّہ قرآن وحدیث میں اس پر قائم ہیں، پھر بے اطمینانی کے کیا معنیٰ؟ اور اگر اطمینانِ عقلی مراد ہے تو میں اس کا ضابطہ ابھی بیان کر چکا ہوں کہ فروع کا ثابت بدلائلِ عقلیہ ہونا ضرور نہیں۔

بائیسویں شبہے کا جواب: اس کے بعد جو لباس کو مذہب یا دین سے بے تعلّق لکھا ہے سو دین سے مراد اگر ارکانِ دین ہے تو بے شک وہ ارکانِ دین میں داخل نہیں، مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ احکام سے بھی خارج ہو، اور اگر احکامِ دین مراد ہے تو اس کو دین سے تعلّق نہ ماننا محض غلط ہے۔ حدیث میں صاف صاف الفاظ میں بہت لباسوں کی ممانعت مع وعید کے وارد ہے، پھر احکام ہونا کس کو کہتے ہیں، پھر یہ جو لکھا ہے کہ بہ مقتضائے زمانہ انگریزی لباس پہنتا ہوں،

اگر کسی وقت مقتضائے زمانہ یہ ہو کہ نماز نہ پڑھیں تو کیا نماز کو بھی خیر باد کہنا جائز کہا جاوے گا؟ اگر کسی وقت یہ مقتضائے زمانہ ہو کہ کلمہ نہ پڑھیں تو کلمہ بھی ناجائز ہو جائے گا؟ البتہ ضرورتِ شدید کی وجہ سے کبھی تخفیف ہو جاتی ہے، سو جب تک کہ ضرورتِ شدید کا اثبات نہ ہو جواز کی گنجایش نہیں۔

تیئیسویں شبہے کا جواب: بچے کی تعلیم کی نسبت جو رائے قرار دی ہے بہت خوب ہے، مگر اس کے ساتھ اتنی رعایت ضروری ہوگی کہ ان علوم دنیوی کو ذریعۂ اکتسابِ نامشروع کا نہ بنایا جاوے۔

چوبیسویں شبہے کا جواب: اس کے بعد لکھا ہے کہ:

''مسلمانوں کی تعلیم کی اگر اصلاح منظور ہو تو دنیوی معلومات سے مدد دوں''۔

عزیز تمنّا ہے کہ اصلاح ہو۔ مگر قدرت نہ ہونے سے کون ذمہ داری کرے، جب اصلاح نہیں کرسکتا ہوں تو دریافت کرنا بھی بے فائدہ، البتہ کوئی معقول بات اگر معلوم ہو جاوے گی تو دوسروں سے کہہ دیا جاوے گا، مگر اصلاح اس کو سمجھوں گا جس میں کسی حکمِ شرعی کی مخالفت لازم نہ آوے، ورنہ وہ سراسر فساد ہے۔

اور یہ جو لکھا ہے کہ مسلمان عنقریب ڈوبنے والے ہیں، سو قدیم علومِ دینیہ کی بدولت تو آگے ہی چل کر ڈوبیں گے، مگر علومِ دنیویہ کی بدولت تو مدت ہوئی ڈوب چکے۔ جس تعلیم کی بدولت مدت سے ڈوب چکے ہوں وہ بے تکی ہے، یا جس سے آگے ڈوبے جانے کا دعویٰ ہے، خواہ صحیح دعویٰ ہو یا غلط، کس کو بے تکی کہنا زیادہ زیبا ہے، تفتیش آزادی کے ساتھ کچھ مضائقہ کی بات نہیں، مگر حق طلبی اور انصاف شرط ہے۔

والسلام

تحریراتِ مذکورہ کا نافع ومؤثر ہونا

بحمدہ تعالیٰ ان جوابات نے اس عزیز کے قلب میں اچھا اثر کیا، بعد چندے تیسرا خط آیا، جس میں یہ عبارت درج تھی:

سابق میں جو نامہ دربارہ معتقدات صادر ہوا تھا میں اس کو حرف بحرف اپنے عقیدے کے موافق پاتا ہوں۔ الحمدللہ! کوئی بات خدشے کی نہیں۔

عرضِ مولف (زادمجدہ)

واقعی جب قلب میں انصاف ہوتا ہے، اور دل سے حق کی طلب ہوتی ہے، حق بات ضرور اثر کرتی ہے۔ دوسرے حضرات عقلا سے بھی اس قسم کے شبہات اتفاقاً پیش آگئے ہیں۔ امید ہے کہ ان جوابات میں منصفانہ نظر کر کے اپنے قلب کو کدورات وظلماتِ شبہات سے پاک کرلیں گے۔ والسلام علی من اتبع الھدی

۵/جمادی الاخری , 1319ھ

1319ھ 1901ء

1362ھ 1943ء
-43 -42
1319 1901